# زخموں کی زبانی

مُصنّف

رِشی دِیو

Rini Dev

# زخموں کی زبانی

مُصنّف

رِشی دِیو

# زخموں کی زبانی

برداشت سے باہر بات گئی آنسوؤں نے بیاں کی
شدت سے لب نہ کھل سکے سنو زخموں کی زبانی
۔ سائل

مصنف
رشی دیو

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔


| | |
|---|---|
| کتاب کا نام۔ | "زخموں کی زبانی" |
| مصنف | رشی دیو |
| تاریخ اشاعت | اپریل 2000ء |
| کل صفحات | 156 |
| تعداد | 500 |
| قیمت | 100 روپے |
| چھاپ خانہ | |

(3)

# تمہید

وادی کشمیر صدیوں سے مختلف مذہبوں اور فرقوں کے درمیان آپسی بھائی چارے اور رواداری کیلئے دُنیا کے سامنے ایک روشن مثال بن کر رہی ہے۔ وقت وقت پر رشیوں اور مُنیوں نے اس کی تہذیبی روایات کو اپنی اخلاقی اور روحانی پاکیزگی سے سجایا سنوارا ہے۔ اتحاد و اتفاق کے شیدائی کشمیری عالمگیر شہرت کے مالک رہے ہیں لیکن اس سب کے باوجود کئی لوگوں کی آنکھوں میں ان کی یہ قابل داد و قابل تعریف تہذیب کھٹکتی رہی اور یہ وادی گلپوش بیرونی تسلط کے تحت مختلف مذہبوں اور فرقوں کے مابین تلخیوں اور دوریوں کا شکار ہوتی گئی اور سازشوں میں اُلجھتی گئی جسکا مقابلہ کشمیری عوام نے ہر بار ڈٹ کر کیا۔ اس صدی کے اوائل ایام میں جبکہ کشمیر میں آزادی کی اُمنگ انگڑائیاں لے رہی تھی یہ منفی قوتیں تب بھی کشمیری عوام کو مذہبی بنیادوں پر بانٹنے کیلئے سرگرم عمل تھیں۔ لیکن نیشنل کانفرنس کے جھنڈے تلے اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ساری کشمیری قوم بلا لحاظ مذہب و ملت ان عناصر کو

اب،

شکست فاش دینے اور حصولِ آزادی کیلئے ایک جھٹ ہو کر کوشاں رہی۔

1931ء سے لیکر آج تک کشمیر کی سیاسی تحریک کئی منزلیں طے کر چکی ہے۔ نیا کشمیر تعمیر کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی خاطر 1947ء سے پہلے سینکڑوں جانبازوں نے اپنی جانیں قربان کیں، اذیتیں جھیلیں اور طرح طرح کے مظالم برداشت کیے۔ تحریکِ حریت سے وابستہ ہو کر میں نے بھی بہت سارے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ اپنے اس لمبے اور طویل سفر کا ذکر جب کبھی بھی اپنے دوست احباب سے کیا تو کئی اپنے ہمدردوں نے مجھے اپنی اس یادداشت اور آپ بیتی کو قلمبند کرنے کا بار بار اصرار کیا۔ راقم کو از حد مسرت ہے کہ راقم اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا ہوں اور اپنے دوستوں و رفیقوں کی فرمائش پوری کرنے میں پورا اترا ہوں۔

اپنی طویل سیاسی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرنا اسلیئے بھی ضروری تھا کہ آنیوالی کشمیری قوم یہ اندازہ لگا سکے کہ اس وقت جو کچھ ہماری ریاست میں ہو رہا ہے اُس کے محرکات کیا ہیں۔ حالات کی پوری جانکاری نہ ہونیکی وجہ سے کچھ لوگ 1931ء میں شروع ہوئی تحریک کو بھی کوستے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک خلوصِ مقصد کے ساتھ اور ذاتی

(ج)

مفادات کی آلائش کے بغیر شروع ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانے میں بھی کچھ عنصر رجعت پسندی کے نظام کو برقرار رکھنے کے درپے تھے۔ تب بھی کچھ لوگ اقتصادی پروگراموں کو مذہب کے نام کے ساتھ جوڑ کر لوگوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے انھیں پست حالی اور اقتصادی بدحالی میں رکھنے کا جال بچھا رہے تھے۔ لیکن اُس زمانے میں اکثر لوگ نیا کشمیر کے پروگرام کی اہمیت و افادیت سمجھتے تھے۔ لوگوں کی اکثریت ایک آس لیے ہوئے تھی۔ اُن میں ایک اُمید تھی سہانے صبح کی۔ لوگوں کی اکثریت نے شیخ محمد عبداللہ پر اعتماد رکھتے ہوئے اس تحریک کو کامیاب بھی بنایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں "کویٹ کشمیر تحریک" کی پاداش میں گورنمنٹ کی طرف سے مقدمہ چلانے کے بعد وہ رہا ہوئے انھوں نے حضوری باغ میں ایک بھاری جلسے میں شامل لوگوں کے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نے اس ریاست میں ذمہ دار نظام حکومت قائم کرنے کیلئے جدوجہد چلائی اور گوناگوں قربانیاں دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم نے شخصی حکومت کے خلاف آواز اُٹھائی تو انڈین نیشنل کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہمیں اخلاقی و مالی حمایت فراہم رکھی

شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہمیں اپنے اس نیا کشمیر کے
کے پروگرام کو آگے بڑھانے کیلئے ہر لحاظ سے کوشاں رہنا
چاہیئے۔ اور اس کام میں ہمیں کشمیر کا ہندو قطب مینار کا کام
دے سکتا ہے۔ کوششیں پیہم جاری رہیں اور شخصی
راج کا خاتمہ ہوا۔ ہم ایک بڑی جمہوریت کے ساتھ وابستہ
ہو کر آزادی کے سپنوں کو ساکار کرنے کی آس لگائے رہے لیکن
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاست کے موڑ بھی بدلتے گئے
وقت نے سیاسی پارٹیوں کے رول ہی بدل ڈالے تھے۔
نیشنل کانفرنس کا وہ جوش و جذبہ روز بروز دھیما پڑتا گیا۔
سست ہوتا گیا۔ اب نیشنل کانفرنس 47ء سے پہلے کا
نیشنل کانفرنس نہیں رہا تھا۔ وقت کے اس سفر میں ہم نہ
جانے کیا کیا بھول بیٹھے اور نیا کشمیر کا پروگرام عدم توجہی سے
نہ جانے کن تاریکیوں اور اندھیروں میں گم ہو گیا۔ رجعت
پسندوں کے خلاف جہاد کرنے والے خود بھی رجعت پسند بن گئے
مذہب کا اسی تحریک کے اتنے اتنے سیاست پر بھی غلبہ
ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ حالات یہاں تک کروٹ بدلے کہ
لل دید اور شیخ العالم کی تعلیمات سے سینچا ہوا کشمیر
اور کشمیریت کا تانا بانا تک اب تار تار ہو گیا ہے۔
یہ سب کیسے ہوا اور کیونکر ہوا۔ اس کا احساس

(ل)

شدت سے مجھے اندر اندر ہی کریدتا ہے اور آج جب میں زندگی کی ڈھلتی شام میں اس پر سوچتا ہوں کہ کہیں ہم لوگوں سے ہی غلطی ہوئی ہے۔

اسی شدید احساس نے مجھے یادوں کے تہہ خانوں میں اترنے کیلئے مجبور کیا۔ وہاں سے جو کچھ بھی ملا اسے صفحۂ قرطاس پر اتار کر میں نے اس بات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی کہ ہم نے کشمیر کی تعمیر نو کیلئے نیک نیتی اور مخلصانہ انداز سے اپنے سفر کی ابتداء کی تھی لیکن ہمارے ہی سیاسی رہنما ہمیں آج کے اس خوفناک اور گھناؤنے انجام پر پہنچا گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کشمیری عوام کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ ہماری لڑائی تو امن اور سچائی کیلئے تھی اور ہم نے تو ہر ایسے خیال پر اپنے دن کا چین اور راتوں کی نیند بھینٹ چڑھائی تھی جو ریاست کے ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں کیلئے ان کی فلاح و بہبود کی بنیاد پر دیدہ و دانستہ طور کیا گیا تھا۔ لیکن اقتدار کے گلیاروں میں ایسے شاطر اور کم ظرف لوگ تھے جو ذاتی مفاد کے لئے سیدھے سادے عوام کو سرِ راہ روندتے اور لوٹتے گئے۔ ساتھ ہی آدمی کو آدمی سے جوڑنے ملانے کے بدلے توڑنے دشمن بنانے پر ڈٹے رہے

(۲)

آزادی کی لڑائی کسی خاص فرقہ کی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ سارے قوم کی مشترکہ جدوجہد تھی۔ کیونکہ ہمیں آگے بھی ایک زندہ قوم کی طرح جینا ہے۔ لیکن بقائے باہم کیلئے ہمیں کھوکھلے اور جذباتی نعرہ بازی کے بدلے ایک صحت مند نظریۂ زندگی اور ایماندارانہ اور مخلصانہ جذبات اور ترقی پسند خیالات کو ترجیح دینی چاہیئے۔ تب کہیں ممکن ہے کہ جو کچھ ہم سے نہ ہو سکا اُس منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کیلئے ہماری نوجوان پیڑھی صف آرا ہو کر کشمیر کی مجروح جسم میں نئی روح پھونک کر ہمارے نیا کشمیر کے خواب کو اکیسویں صدی میں شرمندۂ تعبیر کریں تاکہ وادی میں پھر ایک بار ہندو مسلم دودھ اور شکر کی طرح گھل مل جائیں۔ کشمیر اپنے پُرسکون ماحول میں ایک بار اور جھوم جائے۔ کشمیری لوگ اپنے ورثہ میں پائے اتحاد و یک جہتی کے خوشگوار ماحول میں سانس لے سکیں۔ بقول لل دید ؎

شو چھے تھلہ تھلہ روزان
موزان ہیتو ندیتہ مسلمان
ترک اے چھکھ پیتنے پان برزان
سوے چھے صاحبس ستی زانی زان

یا بمطابق شندہ ریشی ۔

اُکی ہے مالس ماجہ ہندن
تمن دے ترآوِ تھ تہ کنیاے
مسلمانن کنیا وہیند جنے
کر بندن توشہ خوداے

کاش ہم شاعرِ کشمیر غلام احمد مہجور کے کلام پر عمل پیرا ہوں!
جو انھوں نے اپنی ایک نظم میں یوں فرمایا ہے ؎

نیاے ترآوو ماے تھاوِ و پانہ وانی
پوٗر محبت با گرآوِ و پانہ وانی
ہیوٗند شکر دوہ دچھ مسلم صاف صاف
دوہ دتہ بیہ شکر رلاوِ و پانہ وانی

بہرحال اپنے روشن اور تابناک ماضی کے متذکرہ بالا حوالہ کے پیشِ نظر میں آخر میں یہ اعتراف کرنا اپنا اخلاقی فرض مانتا ہوں کہ میں کوئی عالم یا کوئی سلجھا ہوا زباندان نہیں ہوں اور نہ میرا مقصد زباں اور بیان کی شگفتگیوں کا مظاہرہ کرنا ہے۔ میں ایک سیاسی کارکن رہا ہوں میرا مدعا یہی ہے میں نہایت سادگی سے اپنی یادوں اور تجربات کو قلمبند کر کے کشمیر کی تڑپتی روح کی تصویر قارئین کے سامنے پیش کروں۔ میں اب سب ہمدردوں اور دوستوں کا اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہوں جنھوں نے یہ یادیں اور تجربات تحریر کرنے میں میری حوصلہ افزائی کی۔

رشی دیو

# اُمیدوں کا دَور

## سنہ 1947ء سے پہلے

سال 1931 عیسوی کا موسم گرما تھا۔ فضا میں جہاں گرمی کے سبب ایک طرح کی سستی سی چھا گئی تھی وہاں ماحول گرم موسم کی مانند ایک دم گرم تھا۔ افواہیں ریگستان کی آندھیوں کی طرح کثرت سے ایک کے بعد ایک اڑ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنسنیوں کا عالم چھا گیا۔ گل اور بلبل ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جدھر دیکھو کانا پھوسی ہی کانا پھوسی دیکھ پڑتی تھی۔ دودھ اور شکر میں ایک قسم کی کڑواہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ زمانہ تھا سن 31 کا زمانہ جب میں اپنے لڑکپن میں ہی تھا۔ چھٹی جماعت کا ایک طالب علم۔ گاؤں میں خبر بڑی گرم تھی کہ شہر میں بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ سری نگر کے سینٹرل جیل میں پولیس کی گولیوں سے بائیس معصوم لوگ مارے گئے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اس بات پر بڑا صدمہ اور رنج ہوا۔ سارے گاؤں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ پڑی۔ سری نگر سے 50 کلومیٹر دور زینہ پورہ گاؤں کے لوگ بھی اس دلدوز واقعہ پر اپنے غم و غصہ کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ مہاراجہ کے خلاف ایک ناراضگی کی لہر موجزن تھی۔ اکثریتی فرقہ کے دل میں نہ صرف مہاراجہ بلکہ اقلیتی فرقہ کیلئے بھی ناراضگی اور نفرت پنپ رہی تھی۔ شاید اسی لئے وادی کے ہندو خوف و

ہراس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میرے اپنے گاؤں کے ہندو بھی خوفزدہ تھے، سہمے سہمے سے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج اُنھیں اپنے ہی بھائیوں سے ڈر سا لگ رہا تھا۔ وادی کے حالات ہی ایسے موڑ پر آ چکے تھے۔ سری نگر میں سینٹرل جیل کے قتلِ عام کے بعد مہاراجہ کے خلاف اپنے غم و غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں کے ایک بڑے ہجوم نے وچار ناگ میں رہ رہے اقلیتی فرقے کے لوگوں پر دھاوا بول دیا اور اُنکے کئی مکانات کو نذرِ آتش کیا گیا۔ شہر میں اور بھی کئی جگہوں پر آتش زنی اور لوٹ مار کی وارداتیں واقعہ ہوئیں۔ اِس آتش زنی اور لوٹ مار کا نشانہ ہندو لوگ ہی بن گئے۔ مہاراج گنج کے امیر ہندو تاجروں کو خاص طور سے نشانہ بنا دیا گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اِس بھرے بازار کو خاکستر کر کے کھنڈر میں بدل دیا گیا۔ یہ تو شہر کا حال تھا، گاؤں بھی اس سے بچے نہ رہے۔ ہمارے پڑوسی قصبہ شوپیاں میں بھی اکثریتی فرقے نے مہاراجہ کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے ایک بڑا بھاری جلوس نکالا۔ لوگوں کے ہجوم کو سمجھانے بجھانے میں لگے ایک پولیس افسر مادھو کول پر پورا ہجوم جھپٹ پڑا، اور وہ موقعہ پر ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اِس کشمیری پنڈت پولیس افسر کی

ہلاکت سے ہمارے علاقے میں اقلیتی فرقہ حد سے زیادہ خوفزدہ اور حراساں تھا۔ آج اُنکو اپنے ہی بھائیوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ کل تک جن ہمسایوں کی آنکھوں سے اپنائیت و پیار جھلک رہا تھا، آج اُنکی آنکھوں میں غصّے اور نفرت کی لالی چھائی ہوئی تھی۔ ہر فرد کے دل میں نفرت، آنکھوں میں شرارت و غصّہ اور ہونٹوں پر احتجاج تھا۔ ہندو اور مسلم رفتہ رفتہ ایکدوسرے سے دور ہو رہے تھے۔ کشمیر کی مذہبی رواداری کے ہرماں گمبند مس دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

دراصل ہندو مسلم کی ان آپسی تلخیوں، رنجشوں اور دوریوں کے کئی اسباب و محرکات تھے۔ اوّل یہ کہ کشمیری مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ مہاراجہ کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ کشمیری ہندو ہے۔ ہندوؤں کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ شخصی راج ختم ہونے سے اُن کے لئے غیر یقینی صورتِ حال پیدا ہوگا۔ حالات تباہ کن بن جائیں گے۔ اس لئے وہ مہاراجہ کے بغیر اپنے آپکو غیر محفوظ تصوّر کر رہے تھے۔ ویسے بھی یہ خوف و دہشت بلاوجہ نہیں تھا، کیونکہ سامنے دو، تین سو سالوں کی تاریخ تھی۔ چک اور پٹھان دور میں جو ظلم و ستم اُن پر ہوا تھا وہ تو انھیں

ابھی بھی یاد تھا۔ وہ اُسے ابھی بھول نہیں گئے تھے۔ اُن کو لگ رہا تھا کہ ڈوگرہ دور میں جو بھی تھوڑی بہت راحت اُن کو نصیب ہوئی تھی، وہ بھی اُن سے چھینی جا رہی تھی۔ اقتدار کے نزدیک کشمیری ہندوؤں کی مٹھی بھر کا طبقہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ شخصی راج کے خاتمے کے ساتھ ہی اُس کا خاتمہ ہوگا۔ اُن کا دبدبہ بھی ہمیشہ کیلئے اختتام پذیر ہو جائیگا، اور حکومت پر عوام کی پکڑ مضبوط ہو جائیگی۔ ہندو مسلمانوں کی آپسی دوری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بدقسمت کشمیر میں آزادی کا نعرہ گلیوں گلیاروں سے شروع نہیں ہوا بلکہ یہ نعرہ مختلف مساجد اور مذہبی مقامات سے گونج اُٹھا جہاں لوگوں کو مذہب کے نام پر اور مذہب کی اپیل پر اکٹھا کیا جاتا تھا۔ اس بات کے سبب کشمیری ہندو حاشیے پر آ گئے۔ حالانکہ کشمیری ہندوؤں نے کشمیریوں کے حقوق کے تحفظ کی بات تب کی تھی جب کشمیری مسلمان کو ابھی آزادی کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ کشمیری ہندو ہی تھے جنھوں نے اس صدی کی پہلی چوتھائی میں ڈوگرہ شاہی پر یہ دباؤ ڈالا تھا کہ کشمیر کی سرکار میں باہر کے لوگوں کی کسی بھی عہدے پر تقرری پر پابندی لگائی جائے اور باہر کے لوگوں پر کشمیر میں زمین جائداد خریدنے پر بھی پابندی لگائی جائے۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ نے یہ بات مان لی اور 1927ء میں سٹیٹ سبجیکٹ نوٹیفکیشن

جاری ہوا جس کا آجتک کسی نہ کسی شکل میں کشمیر کی ہندو یونین میں اپنی خصوصی پوزیشن کو بحال رکھنے میں اہم اور خاصا رول رہا ہے۔ کشمیری ہندو کی ہی کوششوں سے ایسا ممکن ہوا، لیکن یہ الگ بات ہے آج اس کا فائدہ فقط کشمیری مسلمان اٹھا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ ایک اور سوچے سمجھے پلان کے تحت سیاست اور مذہب خلط ملط ہو رہی تھی۔ یہ کشمیر کی بدقسمتی تھی کہ ایسے موڑ پر وہاں کوئی ایسا صاف ذہن سیاست دان موجود نہیں تھا جو اس سیاسی تحریک کو صحیح سمت دیتا۔ لوگوں میں مذہب کا جنون پیدا کرنے کے بدلے اُن میں سیاسی اور اقتصادی استحکام لانے کی بابت انقلابی جنون پیدا کرنیکی مدبرانہ پہل کرتا۔ غربت اور افلاس صرف مسلمانوں ہی کی داستان نہیں تھی، بلکہ ہندوؤں کی اکثریت بھی اسی حالت زار سے دوچار تھی۔ جن میں ذاتی طور میرا خاندان بھی مملوث تھا۔ وہ وقت ہمارے لئے اس قدر برا تھا کہ دو وقت کی روٹی جٹانا بھی بہت مشکل تھا۔ غرض ہندو کسی بھی صورت میں آسودہ حال نہیں تھا۔

راقم کا جنم ماہِ مئی 1917ء میں زینہ پورہ گاؤں کے ایک غریب کسان کے گھر میں ہوا۔ اسی گھرانے اور اسی گاں میں میرا بچپن گزر گیا۔ زینہ پورہ بجبہاڑہ سے 9 کلومیٹر دور ٹونگری ندی کے کنارے پر بسا ہوا ہے۔ یہ گاؤں کشمیر کے مشہور اور

عوام دوست بادشاہ سلطان زین العابدین نے بسایا ہے، اور اس کے نام پر اس کا نام زینہ پورہ رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی۔ اس گاؤں کیلئے یہ فخر کی بات تھی کہ پاس پڑوس کے گاؤں کے مقابلے میں اُن دِنوں زینہ پورہ میں ایک پرائمری سکول تھا۔ ظاہر ہے کہ ملحقہ دیہات سے بھی طلبا پرائمری تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے زینہ پورہ ہی آیا کرتے تھے۔ اس سارے علاقے میں بجبہاڑہ ہی ایسی نزدیک جگہ تھی جہاں پر ایک لوئر مڈل سکول تھا۔ زینہ پورہ کے پرائمری سکول کی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد مجھے بھی بجبہاڑہ کے لوئر مڈل سکول میں بھیجا گیا۔ زینہ پورہ اور بجبہاڑہ کے درمیان ۹ کلومیٹر کا فاصلہ روز دو دو بار طے کرنا ایک بچے کیلئے تھکاوٹ والا اور صبر آزما کام تھا، لیکن پڑھنے کا از حد شوق تھا، اس زمانے میں حالات بھی ایسے ہی تھے، اس لئے میں نے مشکلات کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کا یہ کام خندہ پیشانی سے انجام لایا۔ بجبہاڑہ میں چھٹی جماعت تک پڑھائی ہوئی۔ اسکے بعد آگے کی پڑھائی کیلئے اننت ناگ جانا پڑتا تھا۔ اس پورے ضلعے میں صرف اننت ناگ قصبہ میں دو پرائیویٹ سکول تھے۔ ایک حنفیہ سکول اور دوسرا مشن ہائی سکول۔ ان کے علاوہ ایک گورنمنٹ سکول بھی تھا جو صرف ساتویں جماعت تک تھا۔ میں نے بھی اسی گورنمنٹ سینٹرل سکول میں ساتویں جماعت تک تعلیم پائی۔ پھر مشن ہائی سکول میں داخلہ لیا لیکن

حالات اور تنگدستی سے مجبور ہو کر پڑھائی ادھوری چھوڑنی پڑی۔ اوّل تو اُن دِنوں میں گھر سے دُور رہ کر پڑھائی جاری رکھنے کیلئے اننت ناگ میں کرائے پر کمرہ لینا میرے والد کے مالی وسائل سے بالاتر تھا۔ اُن دِنوں ہمارے لئے پیٹ کے اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ ان دِنوں لوگوں کی سوچ ہی ایسی ہی تھی۔ والدین تعلیم حاصل کرنے اور پڑھنے لکھنے میں آج کی طرح اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ خود ہمارے باپ دادا اَن پڑھ تھے۔ گھر میں کھیتی باڑی کے موروثی پیشے سے جوں توں کر کے پیٹ کی آگ بجھا کر زندگی کے دِن گزارتے تھے۔ انہی وجوہات کے باعث بالآخر مجھے بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ تعلیم چھوڑ کر میں ایک آدھ سال اپنے گھر میں رہ کر والدین کے کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ مجھے تعلیم کا بے حد شوق تھا اور پڑھائی کو جاری رکھنے کی آرزو تھی۔ لیکن متذکرہ بالا دشواریوں نے میری یہ آرزوئیں اور خواہشیں اُجاڑ کر رکھ دیں۔ میرے ارمانوں کو کچل ڈالا۔ اُن دِنوں لاہور علم و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ اِس حیثیت سے لاہور پورے شمالی ہندوستان میں مشہور تھا۔ لاہور کے علمی گہوارے کے چرچے میں نے بھی جہاں تہاں سُنے تھے۔ میرے دِل میں بھی وہاں جانے کی ہوک سی اُٹھی تھی۔ پڑھائی کو جاری رکھنے کی آرزو سے میں نے بھی اُس علمی و ادبی مرکز میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ویسے تو انسان جس طرح چاہتا ہے اُوپر والا کبھی کبھار اس طرح چاہتا ہے۔ لیکن میں خوش قسمت

تھا۔ میں 19 سال کی عمر میں یعنی 1936ء میں آزادی سے پہلے اس علمی مرکز کی طرف روانہ ہوا۔ لاہور پہنچکر میں نے وہاں دیانند برہم مہا ودیالیہ میں داخلہ لیا۔ اس ودیالیے میں مجھے بہت سے عالموں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان سے کبھی کبھی زندگی کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقعہ بھی ملتا تھا۔ ان عالموں میں ٹھاکر دت امرت دھارا، رائے بہادر بدری داس اور لالہ خوشحال چند، وشو بندھو وغیرہ مشہور عالم بھی شامل تھے۔ لالہ خوشحال چند اخبار روزانہ ملاپ کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں آریہ سماجی مکتبۂ فکر کی طرف راغب ہوا۔ لاہور میں مجھے آریہ سماجی ادب اور سنسکرت علم و ادب کا مطالعہ کرنیکا موقعہ ملا تھا لیکن غربت اور افلاس نے مجھے زندگی کی حقیقت سے بہت قریب لایا تھا۔ اس لئے یہ آدرش وادی باتیں میرے دل کو تسلی دینے میں ناکام ہی رہیں۔ میں لاہور میں ایک ڈیڑھ سال رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کا بھی مرکز تھا۔ وہاں سے کچھ ایسے جریدے نکلتے تھے، جن میں آزادی اور سماجی ترقی کے نت نئے خیالات اور امنگوں کی بہار ہوا کرتی تھی۔ "آریہ گزٹ" اور "آریہ مسٹر" ایسے ہی دو جریدے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لاہور میں رہتے ہوئے مجھے مارکسی لٹریچر کے ماہر راہل سنسکرتیائن اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تصانیف پڑھنے کا موقعہ بھی ملا۔ اس زمانے میں وہاں شہید بھگت سنگھ

راج گورو اور سکھدیو وغیرہ کی قربانیوں کی یادیں تازہ ہی تھیں، اور یہ قربانیاں وطن کے نوجوانوں میں وطن کی آزادی کی خاطر کچھ کر دکھانے کا جوش اور ولولہ پیدا کرتی تھیں۔ اُن قربانیوں کے بارے میں سُن کر اور پڑھکر میرے دل میں بھی وطن پر مر مٹنے کی چاہت نے گھر کر لیا۔ رفتہ رفتہ وطن کی آزادی اور ترقی کے خواب میری آنکھوں میں سمانے لگے اور ان ہی خوابوں کو سینے کے ساتھ لگا کر میں کچھ وقت کے بعد لاہور سے کشمیر واپس آگیا۔

جب میں کشمیر واپس آیا تو اُن دنوں اس ریاست میں مسلم کانفرنس صرف مسلمان فرقے کے حقوق کیلئے لڑتی تھی اور خاص طور پر سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کیلئے زیادہ سے زیادہ نمائندگی کی مانگ کرتی تھی۔ کیونکہ تحریکِ حریت کی آواز بھی مسلم کانفرنس ہی تھی زمین کا حقِ ملکیت اس کانفرنس کا دوسرا مدعا تھا کیونکہ اُس زمانے میں زمین مہاراجہ کی ملکیت تھی۔ اُدھر سرینگر کے کچھ ہندوؤں نے (جو نئی انگریزی تعلیم پا چکے تھے) "یووک سبھا" نام کی ایک تنظیم قائم کی تھی، جو ہندوؤں میں سماج سدھار کیلئے کام کرتی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد سیاسی کم اور سماجی زیادہ تھا۔

وقت وقت پر یووک سبھا مہاراجہ کے خلاف بھی ہو جاتی تھی۔ اور انگریز اس کیلئے اس تنظیم کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ دراصل انگریز اندر سے مہاراجہ ہری سنگھ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خاصکر گلگت

کے معاملے میں وہ مہاراجہ کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ مہاراجہ پر اندرونی طور سے دباؤ بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح مہاراجہ کیخلاف کسی بھی بغاوت، احتجاج اور ایجی ٹیشن کی وہ سرپرستی کیا کرتے تھے۔ وہ مسلم کانفرنس کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مہاراجہ کے خلاف 1931ء کے آس پاس لاہور کے مسلم پریس سے بھی زبردست پروپیگنڈا منظر عام پر آگیا۔ لوگوں میں ہزاروں کی تعداد میں اشتہار بانٹے جاتے تھے جن میں کشمیری مسلمانوں پر مہاراجہ کی طرف سے کیئے جا رہے مظالم کے قصے شایع کیئے جاتے تھے۔ اس سب کا مقصد ریاست کے لوگوں کو راجہ کیخلاف اکسانا تھا اور جسکے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہندو افسروں کے زیر اثر ہے۔ دسمبر 1930ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ایک میٹنگ میں حموں کے کچھ پڑھے لکھے مسلم نوجوان بھی شریک ہوئے جنھوں نے واپس آکر راجہ کیخلاف احتجاجوں کا اہتمام کیا۔ کشمیر میں اس کا اثر پھر بھی اتنا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی برٹش، راجہ کے خلاف کسی بھی معاملے کو الجھانے کے درپے رہتے تھے۔

1931ء کے بعد جب گلینسی کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور اس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ اس کے ردعمل میں یووک سبھا نے ایک ایجی ٹیشن چلائی جو کہ روٹی ایجی ٹیشن کے نام سے بہت مشہور ہے۔ گلینسی کمیشن کے وجود میں آنے کے بعد وادی میں رہنے والے

ہندوؤں نے اپنے آپکو غیر محفوظ پانا شروع کیا وہ اپنے مفادوں کی حفاظت اور حقوق کو منوانے کی غرض سے متحد ہوئے۔

بہر حال لاہور سے واپس آکر میں بھی عام لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ وادی میں مسلم کانفرنس اور یوؤک سبھا کے روپ میں دو ہی پلیٹ فارم تھے۔ اس لئے میں بھی انہی دو میں سے کسی ایک کو چننے کی پوزیشن میں تھا اور ذاتی طور پر یوؤک سبھا میں ہی شامل ہونا میرے لئے ممکن تھا۔ اسطرح میں یوؤک سبھا کا رکن بن گیا۔ میں یوؤک سبھا کی مجلس عاملہ کا رکن بن گیا۔ یوؤک سبھا زیادہ تر شہر کے علاقے میں ہی سرگرم عمل تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سبھا سرینگر کے ایک خاص طبقے تک ہی محدود تھی۔ انکی شہری زندگی اور زندگی کے طور طریقے میرے لئے ایک اجنبی دنیا تھی۔ جسطرح شہری زندگی سے میں ناواقف تھا بالکل اسی طرح اس تنظیم سے وابستہ لوگوں کو بھی دیہاتی زندگی اور اس سے متعلق مسائل اور مشکلات کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ان کو گاؤں کے پچھڑے پن کا مطلق اندازہ بھی نہیں تھا۔ ان دنوں کی دیہی زندگی اور آجکے گاؤں کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گاؤں کی زندگی الجھنوں اور مشکلوں کے بوجھ تلے دبی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر زینہ پورہ گاؤں سے پرائمری تعلیم ختم کرکے مجھے چھٹی جماعت کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے روزانہ اٹھارہ کلومیٹر آنے جانے کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ اکثر گاؤں میں طبی

سہولیات کا بالکل ہی فقدان تھا۔ کئی سالوں کے بعد زینہ پورہ میں ایک ایلوپیتھک ڈسپنسری قائم کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ اس ڈسپنسری کے لئے محکمہ صحت نے ہمارا مکان کرایہ پر لیا تھا۔ کرایہ ماہوار دس روپے مقرر ہوا۔ لیکن ڈسپنسری کے انچارج ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کہا کہ ہم لوگوں کو صرف اس رقم کا نصف دیا جائے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں بحیثیت مالک مکان صرف پانچ روپے ماہوار کرایہ پر اکتفا کرنا تھا۔ لیکن ناانصافی سمجھ کر ہم نے ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ بعد میں اس چالاک ڈاکٹر نے ایسا کھیل کھیلا کہ ڈسپنسری کا کرایہ صرف ماہوار تین روپے مقرر ہوا۔ اس بات کا پتہ بھی ہمیں تب چلا جب سولہ مہینے کے بعد ہمیں اٹھتالیس روپے کرایہ کے طور پر دئے گئے۔ اسکے بعد ایک اور سرکاری کارندہ ہمارے پاس آیا اور کہا کہ وہ اپنے اثر رسوخ کا استعمال کرکے ڈسپنسری کا کرایہ بڑھانے کے لئے ہماری مدد کرے گا۔ اس آدمی نے بطور رشوت ہم سے اپنے باغ کیلئے دو بنڈل تار لی۔ لیکن تار لینے کے بعد اس نے اپنا چہرہ نہیں دکھایا۔ یہ اس زمانے کی ناپرسانی کا عالم تھا۔ اسی ڈسپنسری کے نقشے کے مطابق جب یہ مکان بنانا تھا تو ہم نے ایک سود خوار سے پچاس روپئے بطور قرضہ لیے۔ اس رقم کیلئے ہم نے اس سے ڈیڑھ گنا یعنی پچھتر روپے کا بانڈ دیا تھا۔ قرض کے روپے دیتے وقت ہمیں پچاس کے بدلے سنتالیس روپے

دیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارے اہلکار ہندو ہی تھے اور ہم بھی ہندو تھے۔ اُس وقت کے نظام میں ظلم و جبر کا شکار ہر کوئی غریب تھا۔ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ 1947ء سے پہلے کشمیر میں ہر کوئی ہندو سود خواری کا کام کرتا تھا، اور ہر کوئی مسلم ظلم و ستم کا شکار تھا، انتہائی جھوٹ اور غلط ہے۔ ظالم اور مظلوم دونوں فرقوں میں موجود تھے۔ دونوں فرقوں میں مٹھی بھر سود خوار اور وڈی دار تھے لیکن بھاری اکثریت اُن کے ہی رحم و کرم پر تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سود خوار، وڈی دار دونوں فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح قرضہ لینے والے بھی دونوں فرقوں سے ہوتے تھے۔ ایک سو روپے کا سود چھتیس روپے سے لیکر پچھتر روپے سالانہ تک لیا جاتا تھا۔ اور وڈی داری میں قرضہ لینے کی کچھ مدت بعد اصل زر یعنی اصلی رقم سے ڈیڑھ گنا قیمت کا اناج ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس استحصال اور عتاب کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے۔ اس ظلم کا شکار خاص طور سے کسان طبقہ تھا اور گاؤں کے اکثر ہندو بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میرا تعلق بھی ایک کسان خاندان سے تھا۔ اُس زمانے میں سال بھر کی محنت کے بعد عام کسانوں کیلئے سال بھر کیلئے گزارہ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ کاشتکاری کا زیادہ تر دارومدار قدرت کی مہربانی پر تھا۔ یعنی اگر بارش مناسب وقت پر ہوئی تو فصل معقول ہوئی۔ لیکن اگر موسم موافق نہ رہا تو

کسان کی تمام تر محنت رائگاں ہوئی۔ غرض کسانوں کی زندگی بہت ہی مشکل تھی۔ اُن پر سرکار کا کمچہ بھی تھا اور آفاق سماوی کی تھپیڑیں بھی تھیں۔ آبپاشی کا کوئی خاطر خواہ انتظام ہی نہیں تھا۔ ہمارے علاقے کے کسانوں کو زراعت کی آبپاشی کے لیئے وشنو نالہ سے نہر باندھنے کیلئے ریشی نگر جانا پڑتا تھا۔ اس کام کیلئے زمیندار و کاشتکار دونوں کو مہینے میں تین چار بار نہر کا پانی باندھنے کیلئے جانا پڑتا تھا۔ اس کام کو سرانجام دینے کیلئے ہندو مسلمان سب اکٹھے نکل پڑتے تھے۔ کیونکہ یہ سب کا مشترکہ کام اور مسئلہ تھا۔ ایسے کام میں ہمارا خاندان ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ ایسے ہی بیشتر موقعوں پر صاف عیاں ہوتا تھا کہ گاؤں والوں کے ہندو مسلم کے مسائل الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ ہر گاؤں میں رہنے والوں کے مسائل ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جن کو حل کرنے میں دیہی ہندو مسلم کندھے سے کندھا ملا کر پہل کرتے تھے۔ جیسے اس نہر کا پانی باندھنے کے کام میں میرے والد مرحوم ناتھ رام در بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ وہ گاؤں کا نمبردار ہونیکے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے درجے کے زمیندار بھی تھے۔ میرے بچپن کے ایام میں کئی بار گاؤں کے ہندو مسلم آبپاشی کا انتظام اور دوسرے معاملات مشترکہ طور سرانجام دیتے تھے۔

سماجی سطح پر شادی و بیاہ، خوشی و غمی، مرنے و جینے اور مصیبت کے اوقات پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اپنے علاقے میں چوروں سے رکھوالی کرنا ہو یا کسی افسر کے بے جا ظلم کا مقابلہ کرنا ہو۔ یہ

سارا کام مل جل ہوا کرتا تھا۔ دونوں فرقوں کے لوگ جفاکش اور محنتی ہوا کرتے تھے۔

آپسی برادری اس حد تک قائم تھی کہ ایکدوسرے کی زیارت گاہوں اور مقدس استھانوں پر دونوں فرقوں سے وابستہ لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت حاضری دیتے تھے۔ عرس اور میلوں میں یکساں طور شمولیت کرتے تھے۔ خواہ وہ شمس الدین بغدادی کی درگاہ ہو یا حضرت امیر کبیر کی درگاہ، (موضع وچی میں) شری ورناگ ہو یا آدنیرہ کا استھان ---

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ گاؤں کا اہم مسئلہ طبی سہولیات کی عدم موجودگی کا مسئلہ تھا۔ ان سہولیات کی عدم موجودگی کا خمیازہ مجھے بھی اٹھانا پڑا ہے۔ میری ماں اکتیس سال کی عمر میں ہی مجھے اور میرے دوسرے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے پرلوک سدھاری۔ حالانکہ اس کی بیماری اتنی مہلک نہیں تھی۔ صرف ایک پھوڑا تھا جسکے لئے ہمیں کہیں آس پاس یا کشمیر میں کہیں علاج نہیں ملا۔ اگر دور دور کہیں سے مل بھی سکتا، تنگی اور تنگدستی، بیکسی اور افلاس سے ہمارے پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔ اسی تنگدستی اور مفلسی کی وجہ سے میری ماں بھری جوانی میں ہی لقمۂ اجل بن گئی۔

ہماری پوری تحصیل میں کوئی گورنمنٹ یا پرائیویٹ، مڈل یا ہائی سکول نہیں تھا۔ اننت ناگ جیسے قصبے میں فقط ساتویں جماعت تک، گورنمنٹ کا ایک سینڈل سکول تھا۔ اس کے علاوہ کرسچن مشنریوں کا ایک مشن ہائی سکول اور ایک حنفیہ ہائی سکول ہی اننت

ناگ میں تھے۔ بے کاری عروج پر تھی۔ گاؤں کے تعلیم یافتہ یا پڑھے لکھوں کو زیادہ سے زیادہ پٹواری یا چپراسی کا عہدہ ہی مل پاتا تھا۔ رسل و رسائل کی صورتِ حال اور بھی خستہ اور گئی گزری تھی۔ زینہ پورہ سے شوپیاں، کولگام، بجبہاڑہ یا کہیں بھی جانا ہوتا تھا تو یہ سفر پیدل یا گھوڑے پر طے کرنا پڑتا تھا۔

سماجی زندگی توہمات سے بھری پڑی تھی۔ ناخواندگی عام ہونے کے باعث لوگوں میں جہالت بے حد پائی جاتی تھی۔ مثلاً اگر کسی کو بخار ہو جاتا تو کہا جاتا تھا کہ اُس کے بدن میں کوئی بھوت پریت داخل ہوا ہے جسکو بھگانے کیلئے عجیب طرح سے جھاڑ پھونک کیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں اُسکو بھگانے کیلئے بیمار کی ناک کے نیچے سُرخ مرچیں جلائی جاتی تھیں۔ ایسے مریض کو اگر کسی مولوی کے پاس لے جایا جاتا تھا تو مولوی اُسے کہتا تھا کہ بھوت ہندو ہے اُسکو گائے کے بدن کے بال سے دور کیا جا سکتا ہے۔ عین اسی طرح ہندو پنڈت مریض کو وہ پانی پلاتا تھا جس میں سور کا دانت ڈالا ہوا ہوتا تھا۔ یہ کہکر کہ بھوت مسلمان ہے، جلدی بھاگ جائے گا۔ اکثر بیماریوں کے لئے جھاڑ پھونک کا ہی علاج رائج تھا۔ اس طرح سے بہت سے بیمار بے قضا مر جاتے تھے۔ لوگ توہمات کے قیدی تھے۔ کہیں کہیں اِکا دُکا حکیم وغیرہ تھا جو طب اور یونانی طرز کا علاج کرتا تھا۔ لیکن اس کا فائدہ تھوڑے بہت لوگوں کو ہی ہوتا تھا۔ ہمارے

علاقے میں کوئی ایسا حکیم بھی نہیں تھا۔

گاؤں میں لوگ زیادہ تر تالابوں کا پانی پیتے تھے۔ ہمارے علاقے میں رام پھری کے درجنوں گاؤں ان ہی تالابوں کا پانی پینے کیلئے استعمال کرتے تھے، جن تالابوں سے مویشی پانی پیتے تھے اور لوگ غسل نہانے دھونے وغیرہ کے علاوہ انہی تالابوں میں کپڑے بھی دھوتے تھے۔ ٹونگری نالہ کچھ علاقوں میں لوگ چشموں کا پانی استعمال کرتے تھے۔ زینہ پورہ میں بھی چشموں کا پانی ہی استعمال ہوتا تھا۔

عام کسانوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ مثلاً اگر کسی کو سو روپیہ کا قرضہ لینا پڑتا تو اس بے چارے سے سود خوار یا ڈڈ دار ایک سو پچاس سے لیکر دو سو روپے تک کی تحریر یا ہنڈی لیتا تھا۔ مقروض کسان اگر پانچ پانچ دس دس کرکے یہ قرضہ ادا بھی کرتا لیکن اس کو ان ادائیگیوں کی کوئی رسید ہی نہیں ملتی اور نہ وہ ہی رسید مانگنے کی جرأت کرتا۔ یعنی یہ سارا معاملہ سود خوار کی مرضی اور خوشنودی پر انحصار کرتا تھا۔ اگر ادائیگی کرتے کرتے اب تھوڑی ہی رقم باقی رہتی لیکن بیچ میں ہی سود خوار یا ڈڈ دار ناراض ہو جاتا تو وہ نالش کرکے ڈیڑھ گنا یا دوگنا تحریر کے علاوہ لاگت ڈگری عدالت سے مقروض پر صادر کرواتا تھا۔ رسید کے بغیر کوئی بھی ادائیگی واجب تصور نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طرح اگر کسی کو قرضے کی ضرورت پڑتی تھی تو ڈڈ دار من مانے طور پر جنس کے عوض دے کر کسانوں کو دو دو ہاتھوں لوٹتا تھا۔

اِس وقت میرے ذہن میں ایک واقعہ کی یاد آرہی ہے کہ ہمارے گاؤں میں عمہ چوپان نامی ایک غریب آدمی تھا۔ اُس نے کسی ساہوکار سے ساٹھ روپے کا قرضہ لیا تھا۔ اور اِس پر نوّے روپے کی تحریر لے گیا تھا۔ اسّی روپے ادا کرنے کے بعد بھی وہ کئی بار دس دس، پانچ پانچ روپے ادا کرتا رہا۔ لیکن اس ادائیگی پر اُس کو ساہوکار سے کوئی رسید وغیرہ نہیں ملی تھی۔ دونوں میں آپس میں کسی بات پر اختلاف ہوا۔ ساہوکار نے عمہ چوپان کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ کئی پیشیوں کے بعد عدالت نے عمہ چوپان کے خلاف اپنا فیصلہ دیا۔ جس کی رو سے عمہ چوپان کو ساہوکار کو نوے روپے اور مقدمہ کی لاگت کا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ یہ محض اِس لیے ہوا کہ اُس کے پاس اپنی ادائیگیوں کی کوئی رسید نہیں تھی۔ یہ تھی اُس زمانے میں انصاف کی حالت۔ اس کیلئے لوگوں کی ناخواندگی بھی بہت حد تک ذمہ دار تھی۔

ہمارے علاقے میں خضر بٹ نام کا ایک شخص تھا جو ایک نامور ساہوکار مانا جاتا تھا۔ اُسکے چنگل میں علاقہ بھر کے اکثر کسان پھنسے ہوئے تھے۔

ایسی ہی دوسری ایک دلچسپ اور دل دہلانے والی ایک اور کہانی یہ ہے کہ فتح پور اننت ناگ میں ایک غریب کسان تھا۔ اُسے اپنی جوان بیٹی کی شادی کرنا مطلوب تھا۔ مالی بدحالی اور تنگدستی کی وجہ سے اُس نے شادی کے اخراجات پورا کرنے

کیلئے اپنی زمین میں سے دو کنال زمین بیچنے کا فیصلہ کیا۔ اس گاؤں میں ایک وڈ دار بھی رہتا تھا جسکا اس علاقے میں کافی دبدبہ تھا کسی طرح اس کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی کہ فلاں آدمی بیٹی کی شادی کی وجہ سے اپنی کچھ زمین فروخت کر رہا ہے۔ اُس نے اس غریب کو اپنے ہاں بلایا اور جھوٹی ہمدردی اور اپنائیت دکھا کر اس کو زمین بیچنے سے منع کیا یہ کہہ کر کہ بیٹی صرف اُس کسان کی ہی نہیں ہے بلکہ سارے گاؤں کی عزت ہے۔ یہ بھی کہا کہ اُس کی شادی کیلئے اس وڈ دار کے ہوتے ہوئے زمین بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسان کو یقین دلایا کہ شادی کی رسم انجام دینے کیلئے وہ اُسے مناسب نفع پر مناسب رقم قرضہ پر دیگا۔ جو کہ کسان شادی کی رسم سرانجام دینے کے بعد دھیرے دھیرے جنس کی صورت میں چکائے گا۔ کسان نے اصل رقم سے ڈیڑھ گنا تحریر پر قرضہ لیا۔ شادی کے فوراً بعد وڈ دار نے کسان کو اپنا پیسہ لوٹا دینے کو کہا یہ بہانہ بنا کر کہ وہ خود حج بیت اللہ کے مقدس فرض کو پورا کرنے کیلئے جا رہا ہے۔ کسان پریشان ہوا جس آدمی کو وہ پہلے زمین بیچنا چاہتا تھا وہ بھی اب اُس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ وہ بے بس ہو کر وڈ دار سے بہت عاجزی کرنے لگا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ آخر میں کسان نے اُسے وہی زمین اُسکو ہی بیچنے کی تجویز رکھی جو زمین وہ پہلے کسی دوسرے کو بیچنے والا تھا۔ اپنی چالاکی سے اس رقم کے بدلے اُس نے کسان سے دو کے بجائے تین کنال رقبہ زمین حاصل

کی۔ کسان سے تین کنال زمین چالاکی سے ہتھیا کر وڈ دار حج کو چلا گیا۔ حج سے واپس آکر اُس نے ایک دن اپنے ایک نوکر کو اسی کسان کے گھر بھیجا اور بیلوں کی جوڑی ایکدن کیلئے زمین جوتنے کے لئے مانگی کسان نے جب یہ فرمائش سُنی تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ لیکن غصّہ پیتے ہوئے اُس نے وڈ دار کے نوکر کو یہ کہکر خالی ہاتھ لوٹا دیا کہ اتنی ساری زمین دیکر بھی میرے پاس کیا بقایا ہے کہ مُفت میں بیلوں کی جوڑی دوں۔ وڈ دار کو یہ جواب سُن کر بہت ہی غصّہ آیا۔ اُس کے پاس کسان کے قرضہ کی تحریر تو تھی ہی، اُس نے اسکی عدم ادائیگی کیلئے اس کسان کیخلاف عدالت میں مُقدمہ دائر کیا۔ قرضے کی رقم کی تحریر زمین کا سودا ہونے کے بعد بھی اُسی کے پاس تھی۔ عدالت میں جب تحریر پیش ہوئی تو فیصلہ کسان کے خلاف صادر ہُوا۔ عدالت نے اُسے تحریر میں درج کی گئی رقم کا ڈیڑھ گنا اور مُقدّمہ پر لگائی گئی لاگت ادا کرنے کا حکم دیا۔ کسان کو انتہائی دُکھ ہُوا۔ پاس پڑوسیوں کو بھی اس سارے واقعہ کی علمیت تھی۔ اُن کو بھی اس ناانصافی سے بھی بہت دُکھ ہُوا۔ وہاں پر موضع کا مُکھیا ایک خُدا دوست شخص بھی آتا جاتا تھا۔ اُسے بھی اس کسان کی حالت زار اور وڈ دار کی ظالمانہ حرکت کی بخوبی واقفیت تھی۔ یہ فیصلہ سُن کر اُسے بھی اس غریب کسان پر ترس آیا۔ اُس نے عدالت میں بہ آواز بلند یہ کہا کہ اس رقم کی ڈگری کسان کے بجائے اُسی (خُدا دوست کے) کے نام پر کی جائے۔ اُس نے جج کے سامنے اس بات کیلئے یہ عرضداشت کی کہ اس

غریب کسان پر اس فیصلے سے سراسر ظلم ہوا ہے"۔ اُس نے آگے کہا کہ "اگر انصاف کی حالت یہی رہی تو اس زمین کے پھٹ جانے کا خطرہ ہے۔ جج کے ہاتھ قانون کی رُو سے بندھے تھے۔ اور اُس خدا دوست آدمی کی بات پر غور نہیں کر سکا۔ لیکن وُہ خدا دوست آدمی بعد میں کسان کے بدلے قسطوں پر ڈڈ دار کو وُہ رقم ادا کرتا رہا۔ اسی طرح جاگیرداری کا نظام اُن دِنوں اپنی جڑیں مضبوط کیے ہوئے تھا۔ ہمارے علاقے میں دیوان بدری ناتھ کا ایک بہت بڑا چک (جاگیر) سانگرن میں تھا۔ اسی طرح موضع تلرن میں وزیروں کا چک تھا۔ بمی پورہ شوپیاں میں رازدانوں کا اور تحصیل پلوامہ میں بورا جپورہ میں عزیز میر نامی ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔ قرضہ حاصل کرنے اور کاشتکاری پر زمین کمانے کیلئے اس پورے علاقے کے بیشتر کسان اسی عزیز میر کے رحم و کرم پر تھے آجکل کشمیر کے عام آدمیوں کو یہ تصور دیا گیا ہے کہ 1947ء سے پہلے ہر جاگیردار صرف ہندو تھا، دوسرا یہ بھی کہ سارے ہندو جاگیردار تھے۔ جو کہ بہت ہی غلط تصور ہے۔ اور ایک فرقہ پرست انداز کا تصور ہے۔ اس بے بنیاد تصور کو بنیادی طور پر اکثریتی فرقہ کے اُن لوگوں نے عام لوگوں کے ذہنوں میں ڈالنے کا کام کیا جو اپنے نجی مفادات کیلئے فرقہ پرستی کو شہہ دینے پر 1947ء سے ہی تُلے ہوئے تھے

سچ تو یہ ہے کہ جاگیردار صرف ہندو ہی نہیں تھے۔ بہت سے مسلمانوں کے پاس بھی جاگیریں تھیں اور

وُہ عام کسانوں کا طرح طرح سے اُسی طرح کا استحصال کرتے تھے جیسے کہ جاگیرداری نظام میں کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سرینگر کا سلام شاہ اور مرزا مسہ کلو اور گوپال پورہ کولگام میں عبدالغنی نکرو و شعبان مکرو بڑے نام دار وڈ دار اور جاگیردار تھے۔ اسی طرح عمہ لون منزی پورہ شوپیان بھی ایسے ہی جاگیردار تھے، جن کے پاس لاحدود اراضی زمین تھی۔ الغرض جاگیرداروں میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ دوسرا خیال یہ کہ "سارے ہندو جاگیردار تھے" بھی سراسر غلط ہے۔

گاؤں کے اکثر ہندوؤں کا پیشہ بھی مسلمانوں کی طرح زمینداری ہی تھا اور وہ بھی اُن مسائل سے دوچار تھے، جن سے گاؤں کا کسان ہوتا تھا۔ جیسے مالیہ وصول کرنا ہو، ہندو کسان بھی اُسی طرح سے ظلم و جبر کا شکار ہو جاتا تھا۔ جسطرح مسلمان کسان ہوتا تھا۔ اُن دنوں کاشتکاروں سے مالیہ جبراً وصول کیا جاتا تھا۔ سرکاری کارندے کاشتکاروں سے پیٹ کا نوالہ چھین کر سرکاری گوداموں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھر بھی بھرتے تھے۔ پٹواری، گرداور اور پولیس دو دو ہاتھوں سے کسانوں کو لوٹتے تھے۔ دیہاتوں کے لگ بھگ پچاسی فیصد لوگ اس ظلم کے شکار تھے۔ اسی دوران پورے ہندوستان میں انگریز سامراج کیخلاف تحریک دن پر دن زور پکڑ رہی تھی۔

کشمیر میں مسلم کانفرنس لوگوں کو منظم کر رہی تھی۔

مال شمیر سے زیادہ جموں خطے میں مسلم کانفرنس کا زور تھا کیونکہ یہاں لاہور اور آس پاس کے علاقوں سے انڈین مسلم کانفرنس کے کارکن آتے جاتے رہتے تھے۔ بہر حال کشمیر میں 1922ء اور 1923ء کے درمیانی دور میں ہی غذائی مسائل کو حل کروانے کیلئے عوام کی طرف سے حکومت کیخلاف احتجاجات شروع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی رہنما بھی آئے دن وائسرائے کو اپنی مانگیں منوانے کیلئے یادداشتیں دے رہے تھے۔ لیکن 1930ء میں جب مہاتما گاندھی نے نمک ستیاگرہ شروع کیا اس کی خبریں گرم جوشی کیساتھ وادی کے مختلف اطراف میں بھی پہونچیں۔ اور جب مہاتما گاندھی کو برٹش سرکار نے گرفتار کیا تو سرینگر میں بھی ہڑتال ہوئی۔ سرینگر کے علاوہ کشمیر کے مختلف قصبوں و تحصیلوں میں بھی ہڑتالیں ہوئیں۔ اننت ناگ اور بجبہاڑہ جیسے چھوٹے قصبوں میں بھی تو دکانیں بند ہوگئیں۔ سرینگر کے بڑے بازاروں میں سے لوگوں نے بڑے جلوس بھی نکالے۔ جن میں پہلی بار کشمیر کی سرزمین سے برٹش سرکار کیخلاف فلک شگاف نعروں کی گرج سنائی دی۔

1931ء کے ماہ مارچ میں جب میرواعظ کشمیر کی حیثیت سے مولوی یوسف شاہ سامنے آئے تو کشمیر کی مسجدوں میں حکومت مخالف بڑے بڑے جلسوں کا انعقاد شروع ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ جیسے نوجوان اور پڑھے لکھے لوگ بھی فرقہ پرستی کی

جذباتی رَو میں بہہ گئے اور ان مسجدوں کے جلسوں میں فرقہ پرستی کی آگ اُگلنے والے تقریریں کرتے ہوئے وادی کے اکثریتی فرقے کو مہاراجہ کے خلاف متحد کرتے رہے۔ فرقہ پرستی کی چپیٹ میں رفتہ رفتہ ساری وادی آگئی۔

اس طرح کی ہوا نوح کے پیش نظر کشمیر میں اُبھرتی ہوئی اُس تحریک آزادی سے ہندو لوگ اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرنے لگے جس کا خواب 1931ء سے بہت پہلے پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور اُس کے بھائی نے دیکھا تھا۔ مسلم کانفرنس کی فرقہ پرست سوچ سے کشمیری ہندو کو ان کی یہ تحریک اپنے خلاف لگتی تھی مسلم کانفرنس کی نظروں میں بھی اس شخصی نظام کے بدلے کشمیری ہندو ہی اُن کا بڑا دشمن تھا۔ ہندو کا فقط اتنا ہی قصور تھا کہ اتفاقاً کشمیر کا مہاراجہ ان دنوں ہندو ہی تھا۔ اس لئے فرقہ پرستوں کی نظروں میں کشمیری ہندو ہی حکومت کا تعلقدار تھا۔

اِدھر سرینگر کے ہندوؤں نے جس یووک سبھا کو قائم کیا تھا، اُس کے سامنے بھی مشترکہ سیاسی مقصد کا فقدان ہی تھا۔ یہ تنظیم بھی صرف ہندوؤں تک ہی محدود تھی۔ جیسا کہ راقم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ یہ سماجی تنظیم تو شہری ہندوؤں کے مسائل کو اُجاگر کرتی تھی۔ لیکن دیہی آبادی کے مسائل سے بے بہرہ اور ناواقف تھی۔ غرضیکہ مسلم کانفرنس صرف مسلمانوں کو ہی ساتھ لیکر چلنا چاہتی تھی

اور یوُوک سبھا صرف کشمیری ہندوؤں کو۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلم کانفرنس کے کچھ رہنما یہ بات سمجھ گئے تھے کہ کشمیر کی ترقی کی بنیاد قومی یکجہتی اور مختلف مذاہب کے آپسی میل ملاپ پر منحصر ہے۔ اور اسی خیال کے پیش نظر اب کچھ لوگوں خصوصاً کچھ رہنماؤں نے مشترکہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اسی لئے 1938ء میں غلام محمد صادق کی صدارت میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا۔ اس موقعہ پر شیخ محمد عبداللہ نے مروجہ شخصی راج کی زیادتیوں کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ظلم کا شکار صرف ریاست کا مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم کو بھی ایسے مظالم کا سامنا ہے۔ اس نے شخصی نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی دعوت و ترغیب دیتے ہوئے ریاستی لوگوں کو فرقہ وارانہ برادری اور آپسی میل ملاپ قائم کرنے کے ساتھ ساتھ متحد رہنے کی تلقین کی۔ اسی دوران نیشنل کانفرنس کے جلسے جگہ جگہ پر ہوتے رہے۔ ایسے کچھ جلسوں میں مجھے بھی سامعین کی صف میں شامل ہونے کا موقعہ ملا۔ میری دلچسپی بھی قومی خدمت میں شامل ہونیکی خاطر اندر ہی اندر بڑھتی گئی۔ ایسے کچھ جلسوں کی یاد آج بھی میری آنکھوں کے سامنے چل چتر کی طرح ناچ رہی ہے۔

کریری اننت ناگ میں نیشنل کانفرنس کا ایک یادگاری جلسہ ہوا تھا۔ جسمیں ضلع کے نیشنل کانفرنس رہنما خواجہ غلام نبی (نبہ جی) نے عوام سے خطاب کیا تھا۔ میں نے اُن کی تقریر غور سے سُنی۔ اس

کی باتیں سُن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ لوگ تو میرے ہی دِل کی بات کر رہے ہیں۔ اس کی تقریر سے ایک خوش آئیندہ مُستقبل کی تصویر نمایاں طور پر میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ مجھے نیشنل کانفرنس کا آپسی بھائی چارہ اور ہندو مُسلم سِکھ اتحاد کا یہ نظریہ بہت ہی مُناسب، موزون اور موافق لگا۔ اسی دوران موضع ترنج کوہاں میں شیخ محمد عبداللہ کی تقریر سُننے کا پہلی بار مجھے موقعہ ملا۔ شیخ صاحب کی قد اور شخصیت اور دِل میں اُترتی آواز سُن کر میں از حد متاثر ہُوا۔ دِل میں اُترتی ہوئی آواز (شیخ محمد عبداللہ کی) نے مجھ میں اپنے کشمیر اور اپنے لوگوں کے دُکھ تکلیف دُور کرنے کی اُمنگ پیدا کی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اِس تقریر میں شیخ صاحب نے فرقہ وارانہ قوتوں کو بہت لتاڑا تھا۔ اُس نے لوگوں کو اس بات سے بھی آگاہ کیا تھا کہ مُسلم کانفرنس کے کچھ لیڈر مہاراجہ کے وظیفہ خوار ہیں اور یہ لوگ جاگیردارانہ قوتوں اور کٹر پنتھیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

اِن دِنوں اپنی بقاء کو برحال رکھتے ہوئے مُسلم کانفرنس نے بھی مُسلمانوں پر ہو رہے ظُلم و ستم کیخلاف حکومتِ وقت کے ساتھ ایک بغاوت چھیڑ رکھی تھی۔ مختلف جلسے جلوس ہوتے رہتے تھے۔ ایجی ٹیشن ہو رہی تھی۔ اِس بیچ انگریز سرکار نے بھی مہاراجہ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اُسے اپنی رعایا کیلئے کچھ کرنے کو

راضی کیا۔ اِس طرح سے گلینسی کمیشن کی تشکیل ہوئی۔ اِس کمیشن سربراہ سر بی۔ جے گلینسی تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے پریم ناتھ بزاز نے نمائندگی کی۔ کمیشن نے مسلمانوں کی ترقی کیلئے اپنی جائز و ناجائز سفارشات پیش کیں، جن کی رو سے اُنھیں سیاسی، معاشی، اور اقتصادی رعائتیں ملیں۔ لیکن ہندوؤں کو اِس کمیشن سے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ بلکہ یہ کمیشن اُن کا نوالہ چھیننے کے مترادف تھا۔ اُنکو لگا کہ کمیشن نے پوری طرح اُن کو حاشیے پر لاکر رکھ دیا ہے۔ کمیشن کی سفارشات سے ناراض ہو کر یووک سبھا بھی پریم ناتھ بزاز سے ناراض ہوئی۔ یووک سبھا کو لگا کہ بزاز نے کمیشن کے سامنے ہندوؤں کی اچھی اور مؤثر طریقے سے نمائندگی نہیں کی۔ اور اُن کے مفادات کا تحفظ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ گلینسی کمیشن کی سفارشات کے ردِ عمل میں ہی ہندوؤں نے ایک ایجی ٹیشن شروع کی جو کہ کشمیر کی اِس صدی کی تاریخ میں روٹی ایجی ٹیشن کے نام سے مشہور ہے۔ اِس ایجی ٹیشن کا مقصد ہندوؤں کے مفادات کو تحفظ دینا تھا۔ یہ ایجی ٹیشن بھی مہاراجہ کے خلاف ہی تھی اور برٹش سرکار نے اندر اندر سے اسکی بھی حمایت اور حوصلہ افزائی کی۔ انگریز لوگ ابتداء سے ہی مہاراجہ کیخلاف ہر کسی تحریک کی مدد کرتے تھے اسمیں اُنکا اپنا مفاد تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ کشمیر میں اُنکی مداخلت ایشیا میں روس کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کو روکنے کیلئے از حد ضروری ہے کیونکہ

اپنے جغرافیائی حالات کے اعتبار سے کشمیر ہی اس کیلئے موزوں علاقہ تھا۔ جہاں سے وہ پورے ایشیا پر نگرانی رکھ سکتے تھے۔ اُن کو اس بات کا علم بھی تھا کہ ماضی میں اسی کشمیر سے ہی بدھ پرچارکوں نے اپنے مذہب کا پیغام ایشیا کے کونے کونے تک پہونچایا تھا۔ اسی لئے وہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے سے ہی بلکہ اس سے پہلے بھی کشمیر میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کرنے کیلئے مہاراجہ پر کبھی ایک بہانے اور کبھی دوسرے بہانے دباؤ ڈال رہے تھے۔ بالآخر برٹش سرکار اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ انھوں نے سرینگر میں برٹش ٹریڈ ایجنسی قائم کی جو کہ وسط ایشیا کے ساتھ تجارت پر نگرانی رکھنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ انگریزوں نے راجہ سے گلگت کا علاقہ بھی پٹے پر لے لیا۔ وہ راجہ پر اندرونی و بیرونی دباؤ برقرار رکھنے کیلئے وادی میں بھی بے چینی اور بدامنی پھیلانے اور راجہ کو پریشان کرنے کیلئے ہر بغاوت کو شہہ دیتے تھے۔ غرض وہ کسی بھی طرح راجہ کی سرداری کو چوٹ پہونچانے پر تلے ہوئے تھے۔ اسی طرح وہ مسلم کانفرنس اور یوک سبھا یا اور کسی تنظیم یا ادارہ کے راجہ مخالف احتجاج کو ہوا دیتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کشمیر کی عام جنتا شخصی راج کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ انگریزوں کو یہاں کے عوام سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ وہ کشمیر کے داخلی امور میں زیادہ سے زیادہ دخل اندازی کرکے ہندوستان میں اپنی سرداری کو برقرار رکھنے کی طاق میں رہتے تھے۔ کابل میں بادشاہ امان اللہ

خان کا تختہ پلٹنے کے پیچھے بھی دراصل یہی مقصد کارفرما تھا۔

بہر حال 1931ء کے بعد اگرچہ میں یووک سبھا کے فلاحی اور اصلاحی پروگراموں میں پیش پیش رہا مگر نیشنل کانفرنس کے وجود میں آنے کے بعد میں نے اس کے نظریئے اور پروگراموں کے ساتھ اپنی ذہنی ہم آہنگی پائی۔ میں یووک سبھا سے وابستہ رہا لیکن میری وابستگی اُن کاموں تک محدود تھی جن سے سماج کا بھلا ہوتا۔ مثلاً پُنر وواہ اور دیگر سماجی برائیوں کو دور کرنے کیلئے میں اپنا تعاون برابر دیتا رہا۔ اس کیلئے میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر گھومتا تھا اور مختلف مقامات پر میں نے بہت سی بیواؤں کی دوبارہ شادی رچانے کا کام سرانجام دیا۔ اُس زمانے کے کٹر پسند سماج میں یہ ایک جرأت مندانہ کام تھا۔ اس مشن کو آگے چلانے کیلئے مجھے کبھی کبھی اپنی ہی برادری کے عتاب اور طعنوں کا نشانہ بھی بننا پڑا لیکن میں اپنی ڈگر سے پیچھے نہیں ہٹا۔ میں نے لور خوشی پورہ، مانی ہل اور ترکہ وانگام میں کچھ بیواؤں کی دوبارہ شادی (پُنر وواہ) رچانے کا کام سرانجام دیا مزے کی بات یہ ہے کہ اس کارِ خیر میں مجھے پروہتوں تک نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ کوئی بھی برہمن یا پروہت ایسا لگن کرانے کیلئے سامنے نہیں آتا تھا۔ کیونکہ وہ ایسے کام، دھرم کرم اور کرم کانڈ کے ورودھ سمجھتا تھا۔ کچھ موقعوں پر میں نے پروہت کا کام بھی خود ہی سرانجام دے کے کئی ایسے جوڑوں کو شادی کے بندھن میں باندھ لیا اور اسطرح کئی بیواؤں کے اجڑے گلستان میں پھر سے مسکراتی بہار لوٹ آئی۔

اِس کے ساتھ ساتھ مختلف تیوہاروں پر ہم لوگ سبھا اور آریہ سماج کے جھنڈے تلے جلسے بھی کراتے تھے جن کے ذریعہ ہم لوگوں کو مختلف سماجی بدعتوں، بُری رسموں، چھوت چھات اور ذات پات کی تفریق سے چھٹکارا پانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اِن دنوں کاشمیری پنڈت سماج بہت ہی تنگ نظر تھا۔ سماج میں چھوت چھات بہت پائی جاتی تھی۔ کشمیری پنڈت سماج اُس زمانے میں اپنے فرقے کے سوا کسی دُوسرے فرقے یا نسل کے آدمی کیساتھ کھانے پینے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ ڈوگروں کیساتھ کھانے میں شریک ہونے سے بھی کتراتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مرہامہ میں جب گوبند سنگھ و رگھوناتھ سنگھ نام کے راجپوتوں نے ہون کیا۔ میں نے اس پوتر موقعہ پر اُنکے ساتھ شمولیت کرکے دہی کھانا کھایا لیکن جب میں واپس مُڑا تو ترول گام کے کسی ہندو نے میرے ساتھ بات تک نہیں کی۔ سبھی غصہ بھری نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ اُنکے

مطابق میں دھرم بھرشٹ ہوا تھا۔ ایک اور مثال بجبہاڑہ کی ہے جہاں پر بوہرا اور برہمنوں کے بیچ ایک تنازعہ نے طول پکڑا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ برہمن اُن کے گھروں میں کھانے پینے میں احتیاط کیوں برتتے ہیں جبکہ بوہرا اور برہمن دونوں ہی ہندو ہیں۔ بالآخر برہمنوں نے بوہرا سماج سے کہا کہ وہ ایک یگیہ کریں اور اس موقعہ پر بجبہاڑہ کے سارے برہمن ہون کا پرشاد کھانے میں شریک ہونگے۔ ان برہمنوں میں وادی کے مشہور جیوتشی پریم ناتھ شاستری کے پتا بھی شامل تھے۔ چنانچہ بوہرا فرقے کے لوگوں نے

نے یگیہ رچایا۔ پنڈت اور پروہت لوگ اس میں شریک ہوئے اور دکھشنا کے روپ میں نقد و جنس بھی لے لیا۔ لیکن جب کھانا کھانے کی باری آئی تو سبھی برہمن اُٹھ کر چلے گئے۔ اس بات میں دونوں فریقین کے آپسی تعلقات بگڑ گئے۔ ماحول ایسا بنتا گیا کہ مقدمہ بازی پر نوبت آئی۔ یہ تھی حالت ہمارے جاہل سماج کی۔ اور اسی جہالت سے ہم لوگوں کو چھٹکارا دلانا چاہتے تھے۔ یووک سبھا سے وابستہ ہو کر میں نے اپنے سماج کے اسی چھوا چھوت بھرے فرسودہ سوچ کو دور کرنے کیلئے اور انکو انسانی بھائی چارہ کیساتھ اور مساوات کے اصول سے جینے رہنے کی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ سماج میں جب ایک غریب آدمی کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا بہم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کو بہت سی ایسی سماجی رسمیں اور بدعتیں مصیبت کے سوا کچھ نہیں دیتیں تھیں۔ یووک سبھا اور آریہ سماج کے جھنڈے تلے میں نے عام آدمی کو اس بے فائدہ اور غیر ضروری بوجھ سے آزاد کرنیکی کوشش کی۔

ان اصلاحی کاموں کیساتھ ساتھ میں نیشنل کانفرنس کے نظریات کا بھی اپنے لوگوں میں پرچار کرتا رہتا تھا اور ان کو محسوس کراتا رہتا تھا کہ نیشنل کانفرنس کے نظریئے اور پروگرام ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت کہی جاسکتی ہے۔ اس زمانے میں، میں کچھ اور ترقی پسند خیالات کے لوگوں کی صحبت میں آگیا۔ جن میں مرحوم کشپ بندھو، جیالال کلم، پران ناتھ جلالی، برجن ناتھ ریتہ، موتی لال مصری، محمد یوسف ڈار

اور بنہ جی وغیرہ شامل ہیں۔ میں اکثر ان لوگوں کیساتھ مسائل وقت پر گفت و شنید کرتا رہتا تھا۔ اُن کے ساتھ اور اُن جیسے کئی اور لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع ملتے رہتے تھے اور اس طرح میں نیشنل کانفرنس کی طرف کافی سے زیادہ مائل ہوگیا۔ اسقدر راغب ہوتا گیا کہ 1944ء میں، میں نے باضابطہ طور پر پیوڈک سبھا سے پوری طرح کنارہ کشی اور علیحدگی اختیار کی اور دل و جان سے نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستہ ہوا۔ اس کیلئے 1944ء میں طے کیا گیا "نیا کشمیر" پروگرام بھی ذمہ دار ہے۔ یہ پروگرام مجھے ہر مذہب کے لوگوں کو غربت سے نجات دلانے والا لگتا تھا۔ اسمیں جنس، مذہب و ملت یا کسی قسم کا علاقہ وار تفرقہ چھوڑ کر عام لوگوں کے خوش آئیندہ مستقبل کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ اس طرح میں نیشنل کانفرنس کا سرگرم کارکن بن گیا۔

سیاسی تحریک کے علاوہ میں کچھ سماجی تحریکوں سے بھی وابستہ رہا۔ اس میں بہت سی تحریکیں آزادی سے پہلے بھی چلی تھیں۔ ایک تحریک 1945ء میں چلی۔ اُسوقت یہ خبر چالی تھی کہ گاؤں کے لوگوں کو بھی بیداری کی طرف لانے کیلئے کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ شوپیاں شالہ کھار میں ایک کانفرنس منعقد کرانیکا فیصلہ کیا گیا جسکا مقصد لوگوں میں سیاسی بیداری اور سماجی برائیوں کیخلاف انھیں متحد اور متحرک کرنا تھا۔ اس کانفرنس

میں میرے علاوہ رام کرشن اشموجی، گووند جو رازدان، رادھا کرشن رازدان اور شمبھو ناتھ بھٹ حلیم منتظمین میں سے تھے۔ ہم نے اس کانفرنس کو آرین کانفرنس کا نام دیا تھا۔ اور اسمیں خوشحال چند، مہجور، کشیپ بندھو وغیرہ اس وقت کی کچھ اہم سماجی شخصیتوں کو مدعو کیا تھا۔ اس وقت رام چند کاک پرائم منسٹر جموں و کشمیر تھے اور دیالال وانچو تحصیل شوپیاں کے تحصیلدار تھے۔ انھیں ہماری یہ کانفرنس حکومت مخالف لگی۔ چنانچہ اس کانفرنس کیلئے مسلمانوں نے جوش و جذبہ کیساتھ چندہ دیا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں لیکن مقررہ دن پر حکومت نے وہاں اونٹ ٹھہرائے اور کانفرنس کو ہونے نہیں دیا۔ ہم نے اس کانفرنس کیلئے بہت سارا سامان خرید کیا تھا اور پیسہ بھی اکٹھا کیا تھا۔ وہ پیسہ اس وقت بھی جموں و کشمیر بنک میں موجود ہے۔

1946ء کا زمانہ تھا۔ شوپیاں میں نیشنل کانفرنس کا ایک بڑا جلسہ تھا۔ یہ پہلا جلسہ تھا جسمیں میں نے بھی تقریر کی تھی۔ میں نے عام لوگوں کی حالت زار اور شخصی راج کی غیر ذمہ دارانہ رویے کے موضوع کی تفصیلی وضاحت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کا مئی 1946ء میں آغاز ہوا تھا۔ اس سلسلے میں کشمیر کے گاؤں گاؤں تک یہ آواز اور یہ نعرہ پہنچانے کیلئے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ کچھ ایک جلسے میرے لئے یادگاری ہیں جن میں شوپیاں کا ایک

وہ جلسہ بھی شامل ہے جسمیں سروپ ناتھ، عبدالمجید بانڈے اور میں نے خطاب کیا تھا۔ سروپ ناتھ شوپیاں کے ایک تجارت پیشہ گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور نیشنل کانفرنس کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ اُسے بہت بار تحریکِ حریت کے دوران جیل بھیجا گیا تھا۔ عبدالمجید بانڈے نیشنل کانفرنس کا ایک اور سرکردہ رُکن تھا۔ شوپیاں کے اس جلسے میں ہم تینوں نے ولولہ انگیز تقریریں کیں میں نے شخصی نظام کے استحصال اور ناانصافیوں کو لوگوں کے سامنے رکھ کے انھیں انصاف اور مساوات پر مبنی نئے کشمیر کے نئے نظام کے قیام کی ضرورت کی تلقین کی۔ اس جلسے کے بعد ہی حکومت وقت میرے پیچھے پڑ گئی۔ جسکے نتیجہ میں مجھے روپوش ہونا پڑا مگر روپوش رہنا میری سرگرمیوں کیلئے کوئی رکاوٹ نہ بن سکا۔ بلکہ میں اور زیادہ مضبوطی سے نیشنل کانفرنس کے سیکولر نظریے کی نشو و نما کیلئے زیادہ وقت کام کر سکا۔ تحریک آزادی کے متوالوں کیلئے روپوشی کا مطلب ہے گھر سنسار کے دوسرے مشغولوں سے چھٹکارا پالینا۔ کیونکہ وہ سب کام روپوشی میں ناممکن ہیں۔ لیکن روپوش ہوتے ہوئے آپ صرف تحریک کیلئے ہی جی سکتے ہیں۔ اور اسطرح سے آپ تحریک کے مقصد کیلئے زیادہ سے زیادہ کارآمد بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے بھی روپوش رہ کر "نیا کشمیر" کے پروگرام اور شخصی راج کی خامیوں اور برائیوں کو لوگوں تک

پہنچانے کی بہت کوشش کی اور تنظیمی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتا رہا۔ اس دوران میں گاؤں گاؤں و بستی بستی گھومتا رہا۔ ایک پُرخلوص سیاسی کارکن کی طرح میں نے پُرخلوص طریقے سے سیکولرازم، مساوات اور نیا کشمیر کے خوش آیندہ مستقبل کا پیغام کشمیر کے اطراف و سکنات میں پہنچانے میں اپنا محدود رول ادا کیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں مجھے خود اپنے آپکو "نیا کشمیر" کے پروگرام پر پوری طرح یقین تھا کہ ہمارے رہنما سچ مچ آگے بھی اسی راستے پر چل کر ہمارے قوم کی تقدیر تابناکیوں کی بلندی تک لے جائیں گے۔ اپنے روپوشی کے دن میں نے ہشگپورہ، لتر، دربا غ، کاشہوہ، پرگوچی اور اننت ناگ ضلع کے دیگر کئی دیہاتوں میں گزارے اور نیشنل کانفرنس کے اغراض و مقاصد کا بھی پرچار کرتا رہا۔ اُس زمانے میں، میں کئی بار غلام محی الدین قرہ سے بھی ملا ہوں جو کہ پوری وادی میں "کوئیٹ کشمیر تحریک" کو انڈر گراؤنڈ (Under Ground) طریقے سے چلانیکا منتظم تھا۔ اُس کے ساتھ میں اکثر تحریک کے طور طریقوں اور کام کاج پر تبادلۂ خیال کرتا تھا۔ یہ ملاقاتیں بھی انڈر گراؤنڈ ہی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ میرا رابطہ وید لال جی پرگوچی، موتی لال مصری و عبدالعزیز پیر سے بھی تھا۔ اور ہم سبھی پارٹی لیڈروں کو تحریک اور تحریک کے ساتھ عام لوگوں کے ردِ عمل کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے تھے۔ شخصی حکومت نے چاروں طرف گرفتاریوں کا ایک

بڑا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جیلوں کے جیل بھرے پڑے تھے۔ لوگوں کو طرح طرح اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ تحریک کو کچلنے کے لئے لوگوں کو سختی سے ڈرایا دھمکایا جاتا تھا اور کسی نہ کسی بہانے پیٹا تک جاتا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ عام لوگ خوفزدہ ہو کر حکومت کے خلاف روش سے باز رہیں۔ عام لوگوں کو ہمارے ساتھ بہت ہمدردی تھی کیونکہ انھوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ اُن کے سارے سیاسی و اقتصادی دُکھ اور تکالیف کا ازالہ محض ایک آزادی سے ہی ہو سکتا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں مستقبل کی حسین تصویر تھی۔ دل میں پارسائی اور خوشحالی کے خواب تھے۔ اُن کے یہ خواب اور شاندار مستقبل کی حسین تصویر سجانے اور سنوارنے کیلئے ہی ہم نے اپنی زندگی تحریک کیلئے وقف کی تھی۔ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں وادی کے ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ شخصی حکومت نے بارہا عام لوگوں کے درمیان فرقہ وارانہ تفرق ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ ہندو مسلم کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کروانا چاہتی تھی۔ اس غرض سے وہ اندر ہی اندر مسلم کانفرنس کی بھی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ مسلم کانفرنس کشمیر میں فرقہ وارانہ تفرقہ ڈالکر لوگوں کی اکثریت کو اپنے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس نیشنل کانفرنس ہر فرقے کے لوگوں کو ساتھ لیکر ایک مکمل تبدیلی کی بات کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے سماج کی تعمیر نو کیلئے کوشاں تھی۔ جہاں نہ کوئی بھید بھاو ہو نہ کوئی اونچ نیچ۔ ان

نظریوں کے ساتھ کشمیر کے گاؤں کی اکثر آبادی تھی کیونکہ شخصی راج کے عتاب کو وہی لوگ صدیوں سے سہتے آئے تھے۔

شاید یہ نومبر 1946ء کا زمانہ تھا۔ کوئٹ کشمیر کی تحریک زوروں پر تھی۔ تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے نیشنل کانفرنس کے لیڈر اور کارکن گرفتاریاں دے رہے تھے۔ گرفتاری دینے سے پہلے آزادی کے یہ متوالے خانقاہِ معلیٰ اور دیگر کئی جگہوں پر لوگوں کے بھاری اجتماعوں کو خطاب کرتے تھے۔ ایسے جلسے کبھی کبھی درگاہ شریف حضرت بل میں بھی منعقد ہوتے تھے۔ ایسا ہی ایک بھاری جلسہ سرینگر کے خانقاہِ معلیٰ میں ہو رہا تھا۔ حکومتِ وقت آزادی کی اس سیکولر تحریک کو ہندو راجہ کے خلاف مسلمانوں کے جنگ کی تصویر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ یہ تحریک صرف مسلمانوں ہی کی نہیں تھی بلکہ ریاست کے تمام مذاہب کے غریب عوام کو بیدار کرنے کیلئے ریاست کو آزادی دلانے، خوشحال بنانے کیلئے ایک بامقصد جدوجہد کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس تحریک میں شامل ہو کر میں بھی خانقاہِ معلیٰ کے اس جلسے میں شامل ہوا۔ میں نے لگ بھگ بارہ ہزار لوگوں کی موجودگی میں بلالحاظ مذہب و ملت کشمیر کے ہر لحاظ سے پچھڑے پن کا پورا نقشہ اپنی تقریر میں پیش کرتے ہوئے لوگوں کو متحد ہو کر ریاست کی تعمیر نو میں مذہب و ملت کے لحاظ کے بنا اور قوم و نسل کے لحاظ کے بغیر شامل ہونے کی تلقین کی۔ مجھے اچھی طرح

یاد ہے کہ میں نے اپنی ریاست کے تعلیمی میدان میں پائے گئے پچھڑے پن کی تصویر اور عمر کے تناسب سے دُنیا کے مقابلے میں اسکی حالتِ زار اور محکمہ صحت کی بدحالی، غربت اور جہالت کے دور دورہ کی تفصیلی وضاحت کی۔ جب میری تقریر ختم ہوئی، پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ مجھے ایک رات مہاراج گنج کے تھانہ کی حوالات میں رکھا گیا۔ دوسرے دن دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا کر مجھے عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ بعد میں عدالت نے بغاوت میں شامل ہونے کے مقدمہ کی پاداش میں مجھے چھ ماہ کی قید اور دو سو روپیہ جرمانہ عائد کیا۔ سزا سنانے کے بعد مجھے سینٹرل جیل سرینگر لے جایا گیا۔ سینٹرل جیل آزادی کے مجاہدوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہاں میری ملاقات نیشنل کانفرنس اور تحریکِ حریت کے کئی سرکردہ اور جانے مانے رہنماؤں و کارکنوں سے ہوتی رہی۔ ان میں مولوی سعید، سردار بدھ سنگھ، نرنجن ناتھ رینہ، جیالال تھمیری اور حکیم محی الدین بھی شامل ہیں۔ شاید مقبول شیروانی کے ساتھ بھی سینٹرل جیل میں ہی میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی تھی۔ گرفتار ہونے سے پہلے اپنی تقریر میں، میں نے غربت کی دلدل میں شخصی راج کی لاٹھی کے نیچے ہندو مسلم و سکھوں کے مشترکہ طور دبے ہوئے ہونے کی مثالیں پیش کیں کہ سامعین بہت ہی متاثر ہوئے تھے۔ اس تقریر کے چرچے سینٹرل جیل میں مقید تحریکِ حریت سے وابستہ نوجوانوں اور کارکنوں تک بھی پہنچے تھے۔ چنانچہ جیل کے

وارڈ نمبر سات میں ہم سب آزادی کے متوالے تھے۔ وہاں بھی مجھے باقی لوگ کبھی کبھی تقریر کرنے کیلئے کہتے تھے اور وہاں بھی میں نے کئی بار تقریریں کیں۔ چند ایک تقریروں کی دھندلی سی یادیں آج بھی میری یاداشت کے اُفق پر اُبھری ہوئی ہیں۔ ایک تقریر میں نے رگ وید کی مساوات، اتحاد اور جدوجہد کی تعلیم دینے والے شلوکوں کی مؤثر ڈھنگ سے وضاحت کر کے تحریکِ حریت کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ رگ وید کے آخری منڈل کے اس منتر "سم گچھ رم، سم وِدم، سم ودمنا یہ جانتام، دیوا بھاگیم یتھا پوروے سم جانانا اُپاستے" کو پڑھکر جب میں نے اسکی وضاحت تحریکِ حریت کے سیاق میں کی تو سامعین بہت ہی متاثر ہوئے۔ اپنی ایک تقریر میں میں نے متحد ہو کر سوچنے، متحد ہو کر ایک دل سے کام کرنے اور مل کر بہادری کا اظہار کرنے کی بات کرتے ہوئے سنسکرت کے اس شلوک کا حوالہ دیا تھا۔ "سہنا اوتو، سہنا بھنکتو، سہہ ویریم کرواوہیہ، تیج سنا وِدی تم ماوِد لیشاوہے"۔ یعنی آپس میں نفرت نہ کریں اور مل کر شجاعت و بہادری کا کام کریں۔ میں نے ان شلوکوں اور منتروں کی وضاحت کے ذریعے عوام کو سچائی کے راستے پر چلتے ہوئے آزادی کی مقدس منزل تک پہنچنے کی تلقین کی۔ اس تقریر کے بعد مرحوم مولانا مسعودی میرے پاس آئے اور میری پیٹھ تھپتھپائی۔ اُس نے میری باتوں کو خوب سراہا۔ اور میری کافی حوصلہ افزائی کی۔

سینٹرل جیل میں اپنی نظربندی کے ایام کا مجھے کئی طرح سے فائدہ ہی ہوا۔ مجھے کچھ اچھی کتابیں و دیگر سیاسی لٹریچر پڑھنے کا موقعہ ملا۔ اور مختلف لوگوں سے گفت و شنید کر کے معاملات کو سائنٹیفک نظریے سے جاننے اور سمجھنے کا اچھا موقعہ ملا۔ جیل میں میں نے کئی اچھی کتابیں پڑھیں جیسے "سوشلسٹ سکسٹھ آف ورلڈ" جسکا مصنف ڈین آف کنٹربری تھا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی لکھی ہوئی گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری جیسی شہرۂ آفاق کتاب پڑھنے کا موقعہ بھی مجھے وہیں حاصل ہوا۔ اسکے علاوہ وگیانک بھوتک واد" اور "نئے بھارت کے نئے نیتا" جسکا مصنف راہل سنکرتائن ہے۔ میں نے سبھاش چندر بوس جو کہ میری نظر میں بھارت کی آزادی کا عظیم سپاہی تھے اور لوگوں کو ہر قسم کی پستی سے اوپر اٹھا کر صحیح معنوں میں انگریز سامراج کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہتے تھے، کی تحریروں کا بھی مطالعہ کیا۔ جیل کے باہر اکثر اوقات مطالعہ کیلئے وقت نہیں ملتا تھا۔ اس زمانے میں ایک سیاسی کارکن کی زندگی بہت سی الجھنوں سے بھری پڑی رہتی تھی۔ میری زندگی بھی ایسی کئی پریشانیوں سے دوچار تھی۔

1945ء تک میرے سر پر باپ کا سایہ رہا۔ لیکن اسی سال وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد گھر کا سارا بوجھ میرے سر پر پڑا۔ ذریعۂ معاش کھیتی باڑی تھا۔ لیکن اسکے

لئے محنت و وقت دونوں کی اشد ضرورت تھی جو میں نے آزادی کی جنگ کیلئے اپنے آپ کو وقف کیا تھا۔ اس لئے کھیتی باڑی کی محنت کیلئے میرے پاس وقت کی قلت بھی تھی۔ جوں توں کر کے بس گرہست کی گاڑی کو چلاتا رہا۔ لیکن اپنے گھر کی غربت و افلاس کو اپنے مقصد کے راستے کی رکاوٹ کبھی نہیں بننے دیا۔ خانقاہ معلے سرینگر میں میری تقریر کے بعد مجھ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ جس کے نتیجہ میں قید کی سزا کے علاوہ دو سو روپے کا جرمانہ بھی عاید ہوا۔ اس زمانے میں یہ رقم مجھ جیسے غریب دیہاتی کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میرے پاس یہ جرمانہ بھرنے کیلئے پیسے نہیں تھے۔ لیکن میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک ہی گائے تھی جس کے دودھ سے چھوٹے چھوٹے بچوں کا لالن پالن ہوتا تھا۔ میں نے اسی گائے کو بیچ کر جرمانہ کی رقم بھری۔ گائے کو بیچ کر جرمانہ تو ادا کیا لیکن گھر کے اراکین اور ننھے منے بچے دودھ سے محروم ہوئے جسکے نتیجے میں ان کی نشوونما پر برا اثر پڑا۔ گائے کے ساتھ ساتھ جرمانہ کی رقم پوری کرنے کیلئے اور بھی کئی چیزیں بیچنی پڑیں۔ جس میں کچھ پیڑ بھی شامل تھے۔

بہرحال جیل سے رہائی کے بعد میں پھر سے تحریک حریت کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ میں بڈگام، کولگام اور اننت ناگ کے دور دراز علاقوں میں اپنے باقی ساتھیوں کی مدد سے "نیا کشمیر"

کا پروگرام جلسوں و میٹنگوں کے ذریعہ پہونچاتا رہا۔ کئی بار میں عظیم انقلابی اور عوام دوست کامریڈ دھنونتری کی وساطت سے جموں میں بھی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہوتا رہا۔

لگن، تن دہی اور جانفشانی کے ساتھ تن من سے تحریک کیساتھ وابستہ رہتے ہوئے اگرچہ گھریلو سطح پر مجھے کئی مشکلیں بھی آئیں مگر دل میں ایک اطمینان تھا کہ ہم ایک بڑے کاز کیلئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہے ہیں۔

آخر کار ہندوستان کے ہزاروں نوجوانوں کی قربانیاں رنگ لائیں۔ آزادی کے مجاہدوں کی جدوجہد پھل لائی۔ ہندوستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا۔ لیکن آزادی کے اس ماحول میں ہمارے ہندوستان نے اپنے آپ کو تقسیم کی ضربِ قاری سے کراہتے ہوئے ہی پایا۔ ہندوستان آزاد تو ہوا لیکن اس کے بدن کو کریدکر پاکستان کا وجود عمل میں لایا گیا۔ اسوقت کشمیر کی پوزیشن واضح نہیں تھی۔ وادی کا سیاسی ماحول گرم تھا۔ لگ بھگ سال بھر سرحد پر چھٹ پٹ واقعات ہوتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ 15 اگست 1947ء کا دن کشمیر کیلئے کوئی خاص خوشخبری لیکر نہیں آیا۔ کیونکہ کشمیر میں ابھی شخصی راج ہی قائم تھا۔ لیکن لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انکے ارادے مضبوط تھے۔ شخصی راج کا ختم ہونا طے تھا۔ ان دنوں وادی میں آئے دن انگریزوں کے مشن اور کانگریس و دیگر سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور نمایندوں کے آنے جانے کا تانتا لگا رہتا تھا۔ جن میں

مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُدھر پاکستان بھی کشمیر کو ہڑپنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ علی محمد جناح بھی کشمیر آیا اور شیخ محمد عبداللہ کیساتھ بات چیت کی لیکن وہ بھی ناکام ہو کر واپس چلا۔ پنڈت نہرو کو کوہالہ کے قریب مہاراجہ ہری سنگھ نے قید کروا کے کشمیر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس طرح سے لگ بھگ ایک سال گزر گیا۔

1948ء کا زمانہ تھا۔ میں کئی دنوں سے زینہ پورہ میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا تھا۔ اچانک صبح صبح نور محمد ڈار، محمد عبداللہ بٹ اور غلام نبی نام کا ایک سیاسی کارکن میرے گھر پر آئے۔ انھوں نے مجھے مہاراجہ کے بھاگ جانے، مظفر آباد پر قبائلوں کے حملے اور انکے لوٹ مار، قتل و غارت اور آتش زنی کے ذریعے دہشت پھیلانے وغیرہ کی خبریں سنائی۔ سرحد پر آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے۔ اور ان واقعات کو سننے کے ہم اب عادی ہو گئے تھے لیکن مہاراجہ کا بھاگ جانا حیرت کا باعث تھا۔ ہم سب یہی سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔

دن بھر کئی اور سیاسی کارکن میرے پاس آتے رہے۔

ایک غیر یقینی ماحول سا چھا گیا تھا۔ لوگوں میں خوف و ہراس بھی تھا ساتھ ہی تذبذب بھی۔ بہرحال کچھ دنوں پہلے ہی میں سرینگر چلا گیا تھا۔ اور وہاں راج بنس جو کہ کشمیر چھوڑ دو تحریک کے دوران کشمیر میں ہی مقیم تھے کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ کے پاس صورہ گیا۔

اور جو کچھ ہم آئے دن سن رہے تھے، ان باتوں کے بارے میں ان سے پوچھا۔ لیکن انھوں نے بھی ان باتوں کے بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ ہم نے ان سے مظفر آباد کی افراتفری کے بارے میں پوچھا جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے بات کو ٹالتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ "سکاٹ" نامی پولیس آفیسر کے بھاگ جانے سے لوگوں میں افراتفری مچ گئی۔ "پاویل" بھی ایک اور انگریز افسر تھا، وہ بھی وادی سے چلا گیا۔ اس طرح سے آفیسروں کے چلے جانے سے لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو جاتا ہے اور افواہیں پھیلتی ہیں۔ بہر حال شیخ عبداللہ نے ہمیں افواہ بازوں سے خبردار رہنے اور لوگوں کو متحد رکھنے کی تلقین کی تاکہ پاکستانی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جا سکے۔

پاکستان نے قبائلیوں کے ذریعہ کشمیر پر حملہ کرایا اور مذہبی جنون کی تلوار سے کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت نیشنل کانفرنس تنظیم نے لوگوں کو متحد کر کے حملہ آور کی چالوں کو ناکام بنانے کیلئے اہم رول ادا کیا۔ اس زمانے میں فضا ان فلک پوش نعروں سے گونج اٹھتی تھی۔

حملہ آور خبردار — ہم کشمیری ہیں تیار

کشمیر بنے گا نیا کشمیر — ناظم اعلیٰ شیر کشمیر

نیشنل کانفرنس تنظیم کے کارکن جگہ جگہ جا کر لوگوں کو آپسی بھائی چارہ اور انسان دوستی قائم رکھنے کیلئے متحد کرنے لگے۔ ادھر ہندوستانی

فوج آکر باہری دشمن سے جھوجنے لگی لیکن اندرونی افراتفری سے دفاع بھی وقت کی اہم ضرورت تھی۔ دشمن باہر بھی تھے اور اندر بھی سماج دشمن عنصر اور شرپسندوں کی شکل میں جو اپنی تخریبی کاروائیاں چلانے کیلئے موقعہ کی طاق میں رہتے تھے۔ بہرحال غلام محمد پنو، نورالدین ڈار، غلام نبی اور میں نے اپنے علاقے میں جلسے جلوس کرواکے لوگوں کو متحد اور منظم کیا۔ ہم لوگ اپنے لوگوں کو انتشار سے نکالنے میں لگ گئے۔ مہاراجہ کے بھاگ جانے سے سارا انتظامیہ مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ کون کیا ہے۔ اسوقت بہت سارے عنصر نمودار ہوئے جو اپنے آپ کو فرضی افسر ظاہر کرکے لوگوں سے رشوت کے طور پر روپیہ وغیرہ اینٹھتے تھے۔ ہم نے ایسے عناصر سے لوگوں کو بچانے اور خبردار کرنے کیلئے گاؤں گاؤں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے کے کئی واقعات آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ رشی پورہ، زینہ پورہ کا ہے جہاں ایک کسان کی بیٹی کی شادی کے تنازعے میں ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ اس کی بیٹی نابالغ تھی اور اسکی شادی رد کی تھی۔ ایک شرپسند نے اس معاملہ میں دخل دیکر لڑکی اور اسکے گھر والوں کو ڈرایا دھمکایا۔ ان بھولے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ وہ کوئی اہم سرکاری افسر ہے اور اسکے دستخط کے بغیر کورٹ کا کوئی بھی فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ ان دنوں انتظامیہ کی طرف سے ایمرجنسی آفیسر مقرر کئے گئے تھے جو علاقے کے امن وامان پر نگرانی رکھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی خود کو ایمرجنسی آفیسر

بتاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس خود ساختہ امیر جنبی آفیسر نے لوگوں کو یہ کہکر بہت ہی خوفزدہ کیا تھا کہ اس کے اختیار میں ہے کہ یہ پندرہ گاؤں پر بمباری کرا سکتا ہے۔ ایک گاؤں کا ایک اور واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں ایک بوڑھی عورت تھی جسکا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بھی لنگڑا۔ اُس کو کسی فرضی آفیسر نے یہ کہکر ڈرایا کہ وہ فوج میں بھرتی کرانے والا آفیسر ہے اور وہ اُسکے اکلوتے بیٹے کو بھی محاذ پر بھیجنے جا رہا ہے۔ گھبرائی ہوئی بڑھیا بے چاری نے منت سماجت کر کے ساتھ میں ایک مرغا رشوت کے طور تھما کر اپنے بیٹے کو اس فرضی آفیسر کے چنگل سے چھڑایا۔ ہشنگپورہ میں بجبہاڑہ کا ایک شخص فرضی افسر بن کر لوگوں کی عرضیوں پر فرضی مہریں لگا کر غریب اور معصوم لوگوں سے روپیہ اینٹھتا تھا۔ نہ کہیں انتظامیہ اور نہ کہیں پوچھ۔ اسی افراتفری کے ماحول میں لوگوں کو لوٹا جا رہا تھا اور شیطان خصلت لوگ ایسے بہت سارے منحوس دھندے کر رہے تھے۔

اسی طرح سے افراتفری کے ماحول میں کچھ خود ساختہ مجاہدین بھی فریب دیکر لوگوں کو لوٹنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ پہاڑی لوگوں نے بھی موقعہ غنیمت جان کر اپنے آپ کو فرضی مجاہد ظاہر کر کے لوگوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ ایسے ہی کچھ لوگوں کے گروہ نے کنگن کے علاقے میں کچھ پولیس اہلکاروں و سپاہیوں کو اغوا کر کے تھوڑی دور لیکر اُن کو قتل کر دیا۔ ایسے ماحول میں

لوگوں کو تحفظ اور حوصلہ دینے یا اُن کو منظم کر کے دشمن کی ہر کسی سازش کو ناکام کرنے کیلئے کام کرنے کی از حد ضرورت تھی۔ یہ ضرورت نیشنل کانفرنس کے کارکنوں نے شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بندہ خود بذات ایسے کاموں میں بھی پیش پیش رہا۔ باسکچن شوپیاں میں جب فرضی ایمرجنسی آفیسر لوگوں کو محاذ پر لے جانے کی دھمکیاں دیکر اُن سے پیسے اینٹھ رہا تھا۔ تبھی ہم لوگ وہاں جلسہ کرنے کیلئے پہنچے تو یہ جعلساز وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔

ان حالات میں عام لوگ اپنے آپکو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ حکومت کا ڈھانچہ تہس نہس ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ مقامات پر اُن دنوں جلسے منعقد کر کے لوگوں کے سارے حالات جاننے کے بہت سے مواقع ملے۔ میں اکثر لوگوں کو شر پسندوں سے خبردار کرتا تھا۔ میں نے نیشنل کانفرنس کے دوسرے پُرخلوص کارکنوں کیساتھ زینہ پورہ، فرسل، بجبہاڑہ، ربین گنڈ بہرام، لیتر، کیلر، پاؤمہ اچھن، دمہال ہانجی پورہ، کھری بٹہ پورہ، ترمر نارواو، ناگام کولگام وغیرہ مقامات پر جلسے کرائے۔ جہاں ہم نے لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے اور استحصالی قوتوں اور دراندازوں و حملہ آوروں کی سازش کو ناکام کرنے کیلئے ایک آواز اور ایک جان ہو کر رہنے کی تلقین کی۔ لوگ بھی نیشنل کانفرنس کی طرف اُمید بھری نظروں

سے دیکھتے رہے تھے اور اس تنظیم کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔

لوگ للہ عارفہ اور نندہ ریشی کی روحانی روشنی اور کشمیر کی صدیوں پرانی ریوایت کی علم اونچی رکھتے ہوئے اپنے دیش اور قوم کی خاطر اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھا کر آگے آنے کی ہوڑ لگائے ہوئے تھے۔ مقبول شیروانی اور پشکر ناتھ زاٹو کی شہادت لوگوں میں ایک نیا ولولہ و جوش پیدا کر رہی تھی۔ ڈوڈہ میں بھی سوہنا تھ بیرہ نے اپنی قیمتی زندگی قوم پہ نچھاور کر کے ان اصولوں کی حفاظت کی جو لوگوں میں بھائی چارہ اور اتحاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ان جابرانہ قوتوں کیخلاف جدوجہد کرنیکی حوصلہ افزائی کی جو لوگوں میں نفرت بددلی اور ناامیدی پیدا کر کے غلام بننے کا سبب بنتے ہیں۔ سرینگر میں ایک تنظیم کلچرل محاذ پر کام کرتی تھی۔ جو سٹیج پر ڈرامہ اور دیگر سٹیج پروگراموں سے لوگوں کو حملہ آوروں سے خبردار بھی رکھتے تھے اور انکو اس کا مقابلہ کرنے کیلئے متحد رہنے اور کشمیر کی کشمیریت کی ریوایت کو برقرار رکھنے کی ضرورت سامنے لاتے تھے۔ ان پروگراموں میں کشمیر کے اس پاک و متبرک خطے پر حملہ آوروں کی جابرانہ اور ظالمانہ کاروائی کے منظر اور کئی دل سوز واقعات دکھائے جاتے تھے تاکہ لوگ اپنے جنت جیسے وطن کو غلام بننے اور اس کے تہذیب و تمدن کو بچائے رکھنے میں بڑھ چڑھکر حصہ لینے کی ذمہ داری محسوس کریں۔ ان پروگراموں میں مشہور کشمیری انقلابی شاعر عبدالاحد آزاد، مہجور اور دینا ناتھ

ماہرِ م وغیرہ شاعروں کے ولولہ انگیز اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اس کلچرل سرگرمی میں اور دوسرے کے علاوہ دینا ناتھ نادم، سوم ناتھ زتشی، شیلا بھاٹیہ، زینب بیگم، اوشا، عبدالغنی نمتہ ہالی، نور محمد روشن اور امین کامل پیش پیش ہوتے تھے۔ حملہ آوروں کے مظفر آباد سے آگے بڑھنے کے باوجود لوگوں میں اپنی عزت، بھائی چارہ، مستقبل کا سنہری نیا کشمیر پروگرام بچانے کیلئے حوصلے بلند تھے۔ ان ہی دنوں ایکبار شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر کی پتھر مسجد میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ کشمیر کی خوبصورت وادی کی سرحدیں پانچ ملکوں کیساتھ ملتی ہیں یعنی ہندوستان، پاکستان، کابل، چین اور روس۔ ادھر ریاست کی آمدنی بہت ہی قلیل تھی اور سرحدیں ہزاروں میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان حالات میں اتنے لمبے محاذ پر اتنے کم و قلیل وسائل سے مقابلہ کرکے اپنی آزادی کو بچانا اور نیا کشمیر پروگرام کو جاری رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ رام چندر کاک کے آزاد کشمیر کے نظریے کو شیخ صاحب نے یہ دلیل دیکر رد کیا کہ ایک تو لمبی سرحدوں کی نگرانی بڑی مشکل ہے اور دوسرا اس آزادی کو اتنے کم اقتصادی وسائل سے برقرار رکھنا ہرگاہ ناممکن نہیں تو مشکل کام ضرور ہے۔ اس لئے نیا کشمیر کے پروگرام کی عمل آوری کے لئے جمہوری قدروں کا دامن تھام لینا ضروری بن گیا تھا اور ہندوستان چونکہ جمہوری طاقت کے طور پر سامنے آرہا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ الحاق کرکے اپنے جمہوری پروگراموں کو آگے بڑھانا قدرتی طریقہ تھا۔ اس طرح شیخ صاحب نے کشمیر کے الگ سیاسی وجود کی مذمت

کرتے ہوئے ہندوستان کیساتھ الحاق کو واجب اور ملک کی سلامتی سے تعبیر کیا تھا۔ بہرحال ہندوستان کی فوج اور جموں و کشمیر کے لوگوں کی بہادری اور قربانیوں سے پاکستانی قبائلیوں کا حملہ ناکام ہوا۔ اور ساتھ ہی مہاراجہ کے شخصی راج کا بھی خاتمہ ہوا۔ حکومت، شیخ صاحب اور اس کے ساتھیوں نے سنبھالی۔ شیر کشمیر اس پہلے دور میں ناظم اعلےٰ تھا۔ غلام محمد صادق اور بخشی غلام محمد امیر جنبی چلاتے تھے۔ ہمارے ضلع یعنی ضلع اننت ناگ میں امیر جنبی مرزا محمد افضل بیگ کے زیر کمان تھی اور اسی طرح بارہ مولہ میں صوفی اکبر۔ اس طرح کشمیر بھی غلامی کے ایک لمبے دور سے چھٹکارا پا گیا۔ اور ہم جیسے پرخلوص کارکن اس خوش حال مستقبل کیلئے سنہری پروگراموں کی عمل آوری کا انتظار کرنے لگے۔

O

## 1948ء کے بعد

# اُمیدوں کا بِکھراؤ

قبائلی حملہ پسپا ہونے کے بعد جب حکومت کی باگ ڈور شیخ صاحب نے سنبھالی۔ آزادی کی لمبی جدوجہد کے بعد اب خوابوں کی تعبیر والا دور آگیا تھا۔ اب بھی میں تنظیمی سرگرمیوں میں پوری طرح لگا ہوا تھا۔ میں تن من سے تنظیمی کاموں میں شب و روز مصروف رہتا تھا۔ میں 1949ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل کا ممبر رہا۔ اس کے علاوہ میں اسی تنظیم کا اپنے حلقہ کا حلقہ پریذیڈنٹ بھی تھا۔ 1950ء کے آس پاس مجھے ڈیبٹ کنسلیشن بورڈ (Debt Concelation Board) کا ممبر بنایا گیا۔ جو کہ پرنگر، اننت ناگ، پلوامہ اور کولگام تحصیلوں کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہ تحصیلیں میری تحویل میں رکھی گئی تھیں۔ اس بورڈ کے دوسرے اراکین کولگام کے وکیل شمبھو ناتھ، خواجہ غلام محمد میر سلر اور کچھ وقت کیلئے غلام نبی نائیک بھی تھے۔ اپنی حکومت بننے کے بعد سدھاروں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ ان دنوں کسان قرضداروں کے بوجھ تلے دبے رہتے تھے۔ قرضہ دینے والے ان سے سود در سود وصول کر کے ان کا استحصال کرتے تھے۔ ہوتا ایسے تھا کہ اگر کوئی کسان کسی سود خور سے محض سو روپے قرضہ لیتا تھا تو اسے ڈیڑھ سے لیکر دو سو کی تحریر دینی پڑتی تھی۔ سو روپے کا سالانہ سود کی حد چھتیس روپے سے پچھتر روپے عام تھی۔ جب کسان یہ قرضہ پانچ پانچ دس دس کر کے یا جنس کی صورت میں ادا کرتا

تھا اُسکو سود خور سے اِس قرضہ کی رسید نہیں ملی تھی۔ ایک تو یہ سود خور کی من مانی تھی۔ دوسری وجہ کسان بھی رسید مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اِس طرح کسان قرضہ ادا کرنے کے بعد بھی قسط متواتر طور پر دیتا رہتا اور کبھی کبھی پیڑھیوں تک وہ قرضے کے اِس چکر میں پھنسا رہتا۔ ڈیبٹ کنسلیشن بورڈ نے اُس زمانے میں تقریباً نوے لاکھ روپے کے قرضے قرضداروں اور مقروضوں کے درمیان تصفیہ کروا کے ختم کیے۔ اِس بورڈ کے ذریعے معقول شہادت نہ ہونے پر رسید نہ ہوتے ہوئے بھی اور ساہوکار کے پاس ڈیڑھ گنا یا دوگنی رقم کی تحریر ہوتے ہوئے بھی ہم نے یہ قرض معاف کروائے۔ اس طرح ہزاروں مقروض سود خوروں اور وڈیروں کے چنگل سے آزاد ہوئے۔ اُن دنوں ہمیں لگن تھی، جوش تھا، خلوص تھا۔ ہم جیسے کارکن اقتدار کی گلیاروں اور بھول بلیوں سے دور خدمتِ خلق ہی سب کچھ مانتے تھے۔ یہ بھی سچ ہے آجکل کی مانند سیاسی دخل اندازی نہ تھی۔ یعنی بورڈ اپنے طریقے سے آزادانہ طور پر کام کرتا تھا۔ نہ سیاسی لاٹھی کا زور تھا نہ کسی پیسے والے کا اثر رسوخ۔ غریب کسانوں کی بھلائی ہی اسی بورڈ کا اکیلا اور اہم مقصد تھا۔ بورڈ کے ممبروں نے بھی ایمانداری سے اپنا فرض نبھایا۔ اُن دنوں رشوت جیسی برائی ایک فیصد بھی نہیں تھی۔ اگر تھی بھی لیکن ہم جیسے لوگ ان چیزوں سے کوسوں دور رہتے۔ ہماری سوچ مادہ پرستی سے صاف پاک اور شیخ عبداللہ کی رہنمائی میں نیا کشمیر کا پروگرام ہی

ہمارے اندھیرے راستوں کا اُجالا تھا۔ ہمارے ذہنوں میں ایک اُمید تھی، اُن سُنہرے خوابوں کی تعبیر کی جو تحریکِ حُریت کے دوران ہم دیکھ چکے تھے کہ رُشوت، روپیہ اور زبردستی کے بجائے ہم اپنے لوگوں کی خدمت سے اُنکی ہمدردی اور محبت حاصل کرنا ہی جانتے تھے۔ کیونکہ اِن ہی لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے شخصی راج کے مظالم ہم نے بھی اُن کے ساتھ ساتھ سہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ جو کل تک سارے کشمیریوں کی طرح محکوم و مظلوم تھے۔ آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہی اپنے آپ کو حاکم تصور کرنے لگے اور رفتہ رفتہ انھوں نے بھی وہی طریق کار اپنایا جو طریق کار اُس سے پہلے رائج تھا۔

1950ء اور 1951ء کے سال وادی کے کسانوں کیلئے ناخوشگوار سال تھے۔ کیونکہ اِن سالوں میں پیداوار میں کمی آگئی۔ وادی غذائی بحران سے دوچار ہوئی۔ انتظامیہ اس مسئلے پر قابو پالینے میں بُری طرح ناکام ہوئی۔ کسانوں کو راحت پہنچانے کے بجائے حکومت نے اُلٹے اِن پر وہ مظالم ڈھائے کہ شخصی راج کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ لوگ نیشنل کانفرنس سے بدظن ہونے لگے۔ خاص کر وزیر خوراک مرزا محمد افضل بیگ سے لوگ بہت ہی ناراض تھے۔ نیشنل کانفرنس کے کارکن بھی اُس سے ناامید سے ہونے لگے۔ ایک بار جب وہ نیشنل کانفرنس کے ورکروں سے خطاب کرنے کیلئے گئے۔ انھیں لوگوں کے عتاب سے جلسہ چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ کسان مجوزہ کی وصولی کے طور طریقوں سے

بھی تنگ آگئے تھے۔ لوگوں کو جو سبز باغ تحریکِ حُریت سے پہلے حُریت کے رہنماؤں نے دِکھائے تھے وُہ فقط سراب ثابت ہونے لگے لیکن اِس صورتِ حال میں نیشنل کانفرنس کے ورکروں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ جن میں سے میں بھی ایک تھا۔ ہم نے سوچا کہ اپنے کسانوں کی آواز حکومت تک پہنچانے اور حکومت کی توجہ کسانوں کی حالتِ زار کیطرف مبذول کرانے کیلئے پارٹی کے اندر ہی ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ اِس طرح 1949ء میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کا نام تھا کسان کمیٹی۔ اِس کمیٹی میں میرے علاوہ عبدالغنی ترالی، عبدالرحمان راحت، دامودر ہانجورہ اور موتی لال مصری تھے۔ اس کمیٹی کے جلسے اور میٹنگیں سانگرن شوپیاں، تلرن، لبی پورہ، چک رئیس، شوپیاں، پاری گام اور پلوامہ وغیرہ مختلف مقامات پر ہوئے۔ ہم لوگ کسانوں کے پاس جاکر اُن کو متحرک کرتے تھے کہ وُہ حکومت سے جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کیلئے زرعی اصلاحات لاگو کرائیں۔ اور حکومت پر آبپاشی کے وسائل کو بڑھاوا دینے کیلئے اور کسانوں میں اچھے قسم کے بیج تقسیم کرکے پیداوار کو بڑھانے کا قدم اُٹھانے کیلئے زور دیں۔ اِن باتوں کا ذکر ہم اپنے طور سے نہیں کرتے تھے بلکہ یہ ساری باتیں نیا کشمیر پروگرام میں درج تھی۔ اِس میں کاشتکاری ختم کرکے کسانوں کو زمین کا مالک بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کسان کمیٹی نے کسانوں اور حکومت دونوں کی توجہ اِس صورتِ حال کی طرف دِلائی۔

آخر کار حکومت نے زرعی اصلاحات لاگو کیئے اور سو کنال تک نصف سو سے ایک سو بیاسی کنال تک چوتھا حصہ قیمت پر اور ایک سو بیاسی کنال زمین سے اوپر بلا معاوضہ کسانوں کو تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ حالانکہ اپریل ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ نے لینڈ ریفارمز کمیٹی تشکیل دی جسکے ذمہ جاگیروں کا خاتمہ اور کسانوں کو زمین کا مالک بنانے کا پلان تشکیل دینا تھا۔ لیکن اسکی رپورٹ پیش ہونے سے پہلے ہی شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کے جلسے میں زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ آزادی کے بعد کا یہ پہلا تواریخی اور انقلابی قدم تھا جس سے بہت سے بے زمین کسانوں کو زمین کی ملکیت مل گئی۔ اس سے پہلے کاشتکار پوری طرح سے جاگیردار یا چک دار کے رحم و کرم پر تھا۔ اب وہ اپنے خون پسینے کی کمائی کا خود مالک تھا۔ ان اصلاحات کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر میں ترقی کا ایک نیا باب شروع کیا۔ حالانکہ ان اصلاحات میں کچھ خامیاں ضرور تھیں اور کبھی کبھی لگتا ہے کہ اس قدم میں تھوڑی سی جلد بازی کی گئی لیکن پھر بھی اس قدم کیلئے شیخ عبداللہ کشمیر کے کسان طبقہ میں ہمیشہ کیلئے دل میں گھر کر گئے۔ کیونکہ کل کے بھوکے ننگے اب انکی وجہ سے ہی زمین کے مالک بن گئے تھے۔ سماجی انصاف کی یہ مثال پورے آزاد ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے۔

کسانوں کا دوسرا مسئلہ مجوزہ کی وصولی کا تھا۔ مجوزہ زمین مقدار کے حساب سے زمینداروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ کسانوں

سے جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح گاؤں سے جو شالی جمع ہو جاتی تھی۔ اُسے شہروں اور قصبوں میں رہنے والی آبادی میں بطورِ راشن تقسیم کیا جاتا تھا۔ مجوزہ وصول کرنے کا طریقہ وہی پہلے جیسا جاگیردارانہ انداز کا تھا۔ اسمیں یہ تمیز نہیں برتی جاتی تھی کہ کس کسان سے اُسکی زمین کے حساب سے اور پیداوار و ضرورت کے حساب سے کتنا مجوزہ وصول کیا جائے۔ مجوزہ ہر چھوٹے بڑے کسان سے وصول کیا جاتا تھا۔ جس کسان کی پیداوار سے صرف اُسکے دو یا تین مہینے کی غذائی ضرورت ہی پوری ہوتی تھی۔ مجوزہ اُسکو بھی دینا پڑتا تھا۔ اس میں کوئی رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ صرف بڑے بڑے غلہ داروں اور زمینداروں سے ہی مجوزہ حاصل کیا جائے اور چھوٹے و غریب کسانوں کو چھوٹ دی جائے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ گاؤں میں اناج کی قلت کے باوجود اُس گاؤں سے مجوزہ کا غلہ جمع کر کے شہروں و قصبوں کو پہنچایا جاتا تھا۔ یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی کہ شہر کے مالدار لوگوں کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے گاؤں کے غریب و محتاج کسانوں سے غلہ کی صورت میں مجوزہ وصول کر کے اور بھی محتاج بنایا جاتا تھا۔ مجوزہ میں اگرچہ کسان کو بطورِ ایڈوانس کچھ قلیل رقم دی جاتی تھی لیکن وہ رقم اُسے زمین کا لگان وغیرہ دینے کیلئے واپس گورنمنٹ کو دینی پڑتی تھی۔ یہ بہت ہی سخت قسم کا استحصال تھا جس کا شکار لگ بھگ ریاست کے سارے کسان تھے۔ وہ کسان جن کی اپنی زمین سے ہر سال کے چار پانچ مہینوں

کیلئے ہی غذائی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں اور اسمیں بھی جب کچھ حصہ بطور مجوزہ لیا جاتا تھا۔ ان کا غذائی بحران اور بھی گہرا ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کو سال کے باقی مہینوں کیلئے خوراک کا انتظام کرنے کیلئے وڈاروں اور غلہ داروں سے مہنگے داموں پر شالی خریدنا پڑتا تھا۔ یا شالی خریدنے کیلئے ایسے لوگوں کا مقروض ہونا پڑتا تھا اور ان قرضوں کے سود کی شرح اُس کیلئے اور بھی ناقابلِ برداشت ہوا کرتی تھی۔

مجوزہ کے علاوہ سرکار پروکیور منیٹ نام سے بھی کسانوں سے غلہ وصول کرتی تھی۔ اِس سکیم کے تحت بھی چھوٹے اور بڑے کسانوں میں تمیز نہیں برتی جاتی تھی بلکہ اِس کے تحت اکثر فالتو غلہ رکھنے والے کسانوں زمینداروں کے بجائے خوراک کی کمی کے شکار ہوئے کسانوں سے ہی غلہ اکٹھا کیا جاتا تھا۔ مجوزہ اور پروکیور منیٹ میں محکمہ مال کے رشوت خور اور لالچی اہلکاروں اور افسروں سے بھی پریشانی پیدا ہوئی۔ وہ بالکل اُسی طرح سے کسانوں پر ظلم کرنے لگے جس طرح اُسے پہلے جاگیردار لوگ اُس پر کرتے تھے۔ لگتا تھا آزادی کا سورج طلوع ہونے کے باوجود بھی کشمیر کے کسانوں کیلئے کچھ نہیں بدلا تھا۔ بلکہ عوامی حکومت کے وجود میں آنے سے مجوزہ اور پروکیور منیٹ کے غلط طور طریقوں میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اور لوگوں کو جان بوجھ کر غلط سیاست کے اثر میں جانے پر مجبور کیا گیا۔ تحصیل کولگام کے ناروا و علاقہ میں جہاں لوگوں کی اکثر تعداد غذائی کمی کے شکار تھے وہاں بھی عوامی حکومت بننے کے بعد نہ صرف شالی

بلکہ گندم اور مکئی پر بھی مجوزہ عائد کر کے دکھی لوگوں کو اور بھی دکھی کیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کالے قانون کو نافذ رکھنے کی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ سرینگر اور دوسری غیر زراعتی آبادی کیلئے راشن کی سپلائی برقرار رکھنے کیلئے یہ سب ضروری ہے۔ کسانوں کو ایسا لگنے لگا کہ حکومت شہر والوں کی ہے اور گاؤں والوں کا کوئی سننے والا نہیں ہے۔ مجوزہ وصول کرنے کا طریقہ اتنا جابرانہ اور ظالمانہ تھا کہ اگر کوئی ادائیگی میں تاخیر کرتا تو اسے سزا دی جاتی اور اس سزا کو "ٹکٹکی" کہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شخصی حکومت سے نیا نظام زیادہ ہی ظلم پر مبنی تھا۔ نیشنل کانفرنس کے قائد شیخ محمد عبداللہ نے جو "نیا کشمیر" کی تصویر رکھی تھی۔ وہ اب کسانوں کو دھندلی لگ رہی تھی۔ ان کو لگ رہا تھا کہ یہ آزادی کا وہ سورج نہیں جسکا انتظار انہوں نے غلامی کی ایک طویل رات کو کیا تھا۔ ہم بھی پریشان تھے کہ جس مقصد کیلئے ہم نے تحریک کو سینچا تھا شاید حکومت وقت اس مقصد سے بھٹک رہی ہے۔

آزادی سے پہلے بھی کسانوں پر اس قسم کے ظلم ہوتے تھے اور مختلف جگہوں پر کسانوں نے آزادی سے پہلے بھی آواز اٹھائی تھی کیونکہ شخصی راج میں بھی کسانوں کو لگ رہا تھا کہ وقت کی حکومت گاؤں کے لوگوں کو حالات کے سہارے چھوڑ کر شہر کے ہی لوگوں کا خیال رکھنے کیلئے ہے۔ اسی لئے آزادی سے پہلے دیالگام اننت ناگ میں ایک زبردست کسان تحریک چلی جسکی رہنمائی عبدالسلام تیو اور حبیب اللہ وغیرہ نے

کی تھی۔ جنوبی کشمیر میں کسان تحریک نے ایسا زور پکڑا تھا کہ نیشنل کانفرنس والے بھی اس سے پریشان ہونے لگے تھے۔ وہ اس کے وجود کو اپنے لیئے ایک ٹکر سمجھتے تھے۔ اسی لیئے اس تنظیم کے رہنماؤں نے وقت وقت پر اس تحریک کو ناکام بنانے کیلیئے طرح طرح سے حوصلہ شکنی بھی کی لیکن انھیں اس میں کامیابی نہیں ملی۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مرزا محمد افضل بیگ جب جنوبی کشمیر کی ایک جگہ پر کسانوں کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اس کسان تحریک کے خلاف بولنے لگے تو جلسے میں موجود ایک دیہاتی لڑکی سٹیج پر آئی اور بیگ کے سر پر قصابہ (مسلم عورتوں کے سر کا ایک کشمیری ریوائتی پہناوا) رکھ دیا۔ جسکو بعد میں کسی گمنام عوامی شاعر نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ؎

قصابا ہیٹ کے بدلے دیا دہقان زادی نے

آزادی کے بعد جو کسان کمیٹی نیشنل کانفرنس کے زیر نگرانی بنی اسکا مقصد بھی کسانوں کو اپنے حقوق کے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ ہم لوگ جگہ جگہ کسانوں کو مجوزہ اور پروکیور منٹ کے غلط طور طریقوں کے خلاف آواز اٹھانے کیلیئے متحد کرنے کے لیئے کام کرتے تھے۔ کسانوں نے بھی اس ناانصافی کے خلاف مختلف جگہوں پر احتجاج کیا مگر حکومت اس سب سے بے بہرہ رہی۔ دیوسر کولگام میں ایسا ہی ایک احتجاج ہوا جسکی سربراہی کرم وگے نام کے ایک آدمی نے کی لیکن حکومت وقت اس سب سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

میں نے ذاتی طور کسانوں کی اس ناپرسان صورت حال کا تذکرہ کئی بار مرزا محمد افضل بیگ سے بھی کیا اور مجوزہ پروکیور منٹ کے طور طریقوں میں اصلاح کی ضرورت، اس نظام میں رائج رشوت خوری اور لوگوں کو نیشنل کانفرنس سے بدظن ہونے سے بچانے کے بارے میں میں نے انھیں کئی سجھاؤ بھی دیے۔ میں نے یہ سجھاؤ دیا تھا کہ جو غلہ بلا لحاظ آمدنی و ضرورت غریب کسانوں سے جمع کیا جاتا ہے وہ غلہ اگر بڑے غلہ داروں اور زمین کے بڑے مالکوں سے ہی وصول کیا جائے اس سے اندھا دھند وصولی بند ہو کے کسان طبقے کو راحت کی سانس لینے کا موقعہ ملے گا۔ ساتھ ہی اسکو جبر کرنے والی سرکاری ایجنسی اور مال و کا پریٹو ایجنسی کے لالچی اہلکاروں کے استحصال سے بھی چھٹکارا ملے گا۔ میں نے ریونیو منسٹر اور اپنے ضلع کے نیشنل کانفرنس لیڈر مرزا محمد افضل بیگ کو کہا کہ اس سے ایک تو کافی تعداد میں اناج جمع کیا جا سکتا ہے اور دوسرا عام آدمی جو نیشنل کانفرنس کی حکومت سے بدظن ہوتا جا رہا تھا اسے بدظن ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ مرزا افضل بیگ کا جواب اور دلیل مجھے حیران کن لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ گاؤں کے کچھ غریب لوگ اپنے کوٹھاروں میں غلہ داروں کی شالی رکھکر ان کی شالی کو حکومت کی نظروں سے بچاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حکومت کو سبوں سے مساوی طور پر شالی وصول کرنا پڑتی ہے۔ میں نے انسے یہ بھی عرض کی تھی کہ اکثر دیہاتی لوگ جون جولائی سے فصل تیار ہونے

تک اناج کی قلت کا شکار ہوتے ہیں۔ جسکے باعث یہ لوگ غلہ داروں سے مہنگے داموں اور شرط و شرائط پر قلت کے ان مہینوں کیلئے شالی حاصل کرتے ہیں۔ مجوزہ کے طور پر جمع کیے ہوئے اناج کا کچھ حصہ حکومت کیطرف سے مقامی طور پر ان ضرورت مند اور حاجتمند کسانوں کیلئے جون جولائی اور اگست کیلئے بطور راشن دیا جائے تو یہ کسان لوگ بھی غلہ داروں کے استحصال سے بچ جائیں گے۔ اس سے یہ اپنے کوٹھاروں میں غلہ داروں کا چھپا کر رکھی ہوئی شالی تو اپنے آپ سامنے لا سکتے ہیں۔ میں نے انھیں اس سے متعلق کئی ایسی مثالیں سامنے رکھیں جہاں پر ہم نے تجربہ کے طور پر ایسے اقدام کرائے تھے۔ مثلاً ہنسنگپورہ اور السی پورہ میں لوگوں نے ہی غلہ داروں کے ذریعے چھپائے گئے شالی کی نشاندہی کی اور اسطرح سرکار کو تخمینہ سے زیادہ غلہ اکٹھا ہوا۔ لیکن بیگ صاحب نے ہماری باتوں کی طرف کبھی غور نہیں فرمایا نہ توجہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ ہم تو لوگوں کا دکھ درد دیکھکر ایسا سوچتے تھے لیکن پارٹی اور انتظامیہ کے اندر کے حلقوں کے داؤ پیچ کی ہم میں لاعلمی تھی۔ مجوزہ اور پروکیور منٹ کا سلسلہ جاری رکھنے میں حکومت وقت کے کچھ عناصر خاصی دلچسپی رکھتے تھے کیونکہ انکو اس طرح سے ظلم و ستم کر کے غلہ وصول کرتے ہوئے سرکار کے کھاتے کیساتھ ساتھ اپنے لیے بھی کافی کچھ مل سکتا تھا۔ وہ بہت کچھ حصہ اپنے لیے بھی رکھ لیتے تھے۔ اکثر پروکیور منٹ کے افسر و چار شکاری بندوق والے لوگ اپنے

ساتھ رکھکر کسی گاؤں میں شالی جمع کرنے جاتے تھے اور من مانے ڈھنگ سے وہاں عہدے کا ناجائز استعمال کرتے تھے۔ اس طرح سے عام لوگ سیاسی طور پر نیشنل کانفرنس کی سیاست سے دور ہو کر فرقہ پرستی کی سیاست اور پاکستان سے اُمیدیں باندھنے لگ جاتے تھے۔ ایک گاؤں کا واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ تحصیل کولگام کا ایک چھوٹا سا گاؤں وُنی پورہ جو کہ کلیتا گاؤں کے نزدیک ہی بسا ہوا ہے۔ یہاں پر جب پروکیئورمنٹ افسر بندوقچیوں کو ساتھ لیکر شالی جمع کرنے وارد ہوا تو کسانوں میں سے ایک کسان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ نوجوان نے ذرا اونچی آواز میں اس افسر سے صرف اتنا کہا کہ نئی فصل تک ابھی چار مہینے باقی ہیں۔ اُن کے پاس اتنی شالی بھی نہیں ہے کہ وہ حکومت کو دے سکتے ہیں۔ اتنا ہی سُنکر پروکیئورمینٹ آفیسر آگ بگولہ ہو گیا۔ کیونکہ نوجوان کی یہ سچائی اُسے حکومت اور اپنی شان کے خلاف لگی۔ اُس نے کسان نوجوان کو پیٹنا شروع کیا اور تب تک پیٹتا رہا جب تک کہ وہ نوجوان لقمۂ اجل بن گیا۔ اس دہشت اور تشدد کی کچھ اور مثالیں بھی ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ایسے بے رحمانہ واقعات کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ اگر کوئی کسان ایسی باتوں کی شکایت کرتا تو اُسے پاکستانی ایجنٹ کا نام دیکر اور بھی قافیہ تنگ کیا جاتا تھا۔ اس دہشت سے وہ لوگ جو کل "حملہ آور خبردار = ہم کشمیری ہیں تیار" کا نعرہ بلند کر کے حملہ آور کے خلاف صف آرا ہوئے تھے آج اپنی اُمیدیں اور

ہمدردیاں اُسی کیساتھ شامل کرنے پر اپنے ہی آقاؤں اور رہنماؤں نے مجبور کیے۔ ریونیو، کوآپریٹو کے علاوہ پروکیورمینٹ کے اہلکار اندھا دھند طریقے سے دولت کمانے لگے اور لوگ نیشنل کانفرنس کی حکومت اور نیا کشمیر کے پروگرام سے دور ہونے لگے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا اس ظلم و جبر کے خلاف وقتاً فوقتاً آواز اُٹھتی تھی لیکن اُسے نہایت ہی بے رحمی سے دبایا جاتا تھا۔ اور لوگوں کو سیاسی بیداری کے بدلے سیاسی بیزاری کے عالم میں دھکیلا جا رہا تھا۔

اُن ہی دنوں سارے ہندوستان میں سیف الدین کچلو کی سربراہی میں ایک تحریک چل رہی تھی جو کہ امن تحریک کے نام سے جانی جاتی تھی یہ امن تحریک ایک غیر سیاسی تنظیم تھی جو کہ صرف ایٹم بم پر پابندی لگانے کیلئے دنیا کے مختلف کونوں میں اُنکی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملانے کو کوشاں تھی۔ یہ تحریک دوسری عالمی جنگ کے بعد ناگاساکی اور ہیروشما میں ایٹم بم سے ہوئی بے مثال تباہی و بربادی اور لاکھوں لوگوں کے مر جانے اور طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہونے کی وجہ معرض وجود میں آئی۔ اس کا ایک ہی مقصد عالم انسان کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچا کر امن کی بحالی اور نشوونما تھا۔ جیولیو کیوری، بسکاسو، ڈین آف کنٹربری اس تحریک کے عالمی سطح کے سربراہ تھے۔ اُنکی ہی دیکھا دیکھی ہندوستان میں بھی یہ تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک غلام محمد صادق کی رہنمائی میں کشمیر میں بھی

شروع ہوئی۔ اس کمیٹی سے وابستہ لوگ "ایٹم بم پر پابندی لگانے کے منشور پر دستخطی مہم کے تحت لوگوں کے دستخط کرانے اور امن عالم قائم کرنے کیلئے جلسے کراتے تھے۔ امن کی آبیاری کرنے کیلئے میں بھی اس تحریک سے وابستہ ہوا۔ کیونکہ اس دنیا میں انسان کی سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی ترقی کیلئے اولین شرط صرف امن ہے۔ میرے خیال میں ہر آدمی کو امن کے قیام کیلئے اپنی طرف سے کوشش کرنی چاہیئے۔ اس سے بڑھکر کوئی بھی خدمت خلق نہیں ہے۔ بہرحال امن کانفرنس کے ساتھ میں بھی وابستہ تھا۔

ایک دن میں صادق صاحب سے ملا۔ میں نے انھیں تحصیل کولگام کے کچھ کارکنوں کے بارے میں کہا۔ جن کو بیگ صاحب نے فیکشنل Factional وجوہات پر نیشنل کانفرنس سے نکالا تھا۔ ان میں عبدالکبیر بھی شامل تھا۔ عبدالکبیر تحصیل کولگام کے ژوکولگام گاؤں کا ایک سرگرم نیشنل کانفرنسی کارکن تھا۔ لیکن حکومت سنبھالتے ہی نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے اپنی حکومت کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کیلئے اپنی غلط پالیسیوں کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ پوری وادی میں انکے بغیر اور کوئی آواز نہ رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کارکن جو نیا کشمیر پروگرام روبہ عمل دیکھنے کیلئے نیشنل کانفرنس سے وابستہ تھا، مفاد پرست لیڈرشپ نے ایک ایک کرکے ایسے لیڈروں اور سیاسی

کارکنوں کو پارٹی سے چلتا کرنے کی پالیسی جاری رکھی۔ چنانچہ عبدالکبیر بھی ایسا ہی بے باک و بے لوث کارکن تھا اُسکو بھی پارٹی سے چلتا کردیا گیا تھا۔ اُس پر ممبر شپ کی رقم ہڑپنے کا مقدمہ بھی صادر کیا گیا۔ جسکے نتیجہ میں وہ روپوش ہو گیا۔ وہ اس کے بعد محی الدین قرہ کی قائم کی ہوئی پولیٹیکل کانفرنس سے نزدیکیاں بڑھا رہا تھا۔ میرے من میں خیال آیا کہ اگر عبدالکبیر جیسے کچھ کارکنوں کو امن کانفرنس کے دائرے میں لایا جائے۔ پھر وہ نیشنل کانفرنس چھوڑ کر دوسرے پلیٹ فارم پر جانے کی کوشش نہیں کرینگے۔ اسی غرض سے میں نے ایک بار صادق صاحب کے سامنے یہ کارکن اس تحریک میں شامل کرکے اُنکو غلط راستوں پر جانے سے روکنے کی تجویز رکھی۔ ایسا اسطرح کیا جاسکتا تھا کہ وہاں پر امن کانفرنس کا ایک جلسہ منعقد کرانا تھا جسکے لئے ہم نے صادق کو بھی دعوت دی۔ انھوں نے بھی اس جلسے میں شامل ہونیکی رضامندی ظاہر کی۔ میں نے اُسے اس کنونشن میں عبدالکبیر وانی کو شامل کرنے کی بات بھی کہی تھی۔ چونکہ بیگ صاحب نے دراصل اس علاقے میں اپنے ایک رشتہ دار کی اجارہ داری برقرار رکھنے کیلئے وانی کے خلاف سازش کرکے اُسے پارٹی سے بیدخل کرایا تھا لہذا بیگ صاحب نے جب اس جلسے کے بارے میں سُنا تو اُس نے جلسہ نہ کرنے کی صلاح دی۔ میں نے اُس سے بھی عرض کی کہ یہ امن کانفرنس ایک غیر سیاسی کانفرنس ہے اور اس میں عبدالکبیر کو ہم اس لئے شامل کر رہے ہیں تاکہ وہ بھٹکنے سے

بچ جائے مگر بیگ صاحب پھر بھی راضی نہ ہوئے۔ بہر حال صادق صاحب کے اقرار پر ہم نے کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ریاست میں امن تحریک کا سربراہ وہی تھا۔ اس لئے ایسا کرنے میں ہم حق بجانب تھے ہم نے علاقے کے گاؤں گاؤں میں اس کانفرنس کے منعقد ہونے کی تشہیر کی اور اسمیں غلام محمد صادق کے شریک ہونے کا بھی پرچار کیا۔ ان دنوں مسٹر میر قاسم، مرزا محمد افضل بیگ کابینہ میں آئے تھے۔ وہ بیگ کے کہنے سے صادق کے پاس جا کر اس کانفرنس میں شرکت نہ کرنے کیلئے دباؤ ڈالنے لگا۔ اسے یہ کہا گیا کہ یہ کچھ ہندوؤں کا جلسہ ہے۔ اور ساتھ ہی اسمیں مجوزہ اور پروکینیو رمینٹ کے خلاف بھی آواز اٹھائی جائیگی۔ اس کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ اس کانفرنس کا انعقاد نیشنل کانفرنس کے مفاد میں نہیں ہے۔ مرحوم صادق میر قاسم کی باتوں میں آگئے اور مقررہ دن وہ اس کانفرنس میں شامل ہونیکی معذرت ظاہر کرنے لگے۔ میں نے اور مرحوم دامودر بھٹ ہاکجورہ نے جب اگلے دن مرحوم صادق کو اس جلسہ میں شامل ہونے کی بات یاد دلائی تو انھوں نے انکار کیا۔ دراصل میر قاسم نے اس کانفرنس کی غلط تصویر صادق صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔ بہر حال کانفرنس کی تیاری ہم نے پھر بھی زور و شور سے جاری رکھی لیکن مقررہ دن مرزا افضل بیگ کی شہہ پر علاقے کے کچھ غنڈوں اور پائیس آرمڈ پولیس جوانوں سے بھرا ٹرک کانفرنس کی جگہ پر دھاوا بولنے کے لئے نمودار ہوا۔ انھوں نے وہاں خوف و دہشت اور افراتفری و ہاہا کاری

مچائی پلیٹ فارم کو اکھاڑا گیا۔ ڈیلی گیٹوں کیلئے لنگر لگا تھا۔ لنگر پر حملہ کر کے سارا کھانا ضائع کیا گیا۔ ہم پر بھی حملہ بول دیا گیا۔ اس حملے میں عبدل رحمان راحت، موتی لال مصری، دامودر بھٹ، عبدالکبیر وانی اور مجھے ایک ایک کر کے نشانہ بنا دیا گیا۔ عبدالکبیر کو گرفتار کیا گیا کیونکہ اس پر نیشنل کانفرنس کا ممبر شپ فنڈ ہڑپنے کا الزام پہلے ہی لگایا گیا تھا۔ میرے خلاف دفعہ پانچ سو بارہ کے تحت وارنٹ جاری کرائی گئی۔ مجھے غنڈوں سے پٹوایا گیا۔ اس حملے میں کولگام میں دہشت کی لہر پھیل گئی۔ دامودر بھٹ کے سر پر چوٹیں آئیں جب وہ سرینگر واپس گئے۔ سرینگر پہنچ کر چوٹ کھانے والوں نے اپنی چوٹیں وکیلوں کو دکھائیں۔ ان کے ساتھ عبدالرحمان راحت اور موتی لال مصری بھی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کہ غنڈوں کی جارحانہ کاروائی کیلئے ایک مشہور وکیل لطیف احمد کی سربراہی میں ایک ڈیفنس کونسل کی تشکیل ہوئی۔ جب یہ خبر غلام محمد صادق نے سنی تو وہ کولگام کیلئے روانہ ہوا۔ وہ مجھے بجبہاڑہ میں ملے اور چھپاتے چھپاتے مجھے اپنے ساتھ اننت ناگ لے گئے جہاں ہم میر قاسم کی قیام گاہ پر گئے، وہاں صادق مرحوم نے مجھے ایک کمرے میں چھوڑ دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں پر اسوقت کے ڈپٹی کمشنر اننت ناگ بھی حاضر تھے۔ وہاں وہ ڈپٹی کمشنر پر برسا۔ اسے یہ کہا کہ عوامی حکومت میں بھی اگر ہم امن کیلئے کی جارہی کانفرنس یا کنونشن کو کوئی بہانہ بنا کر اس ظالمانہ انداز سے دبائیں تو پھر ہم

پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی کی بات کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ تو پریس اور تقریر کی آزادی کے حق کیساتھ ایک کھلا مذاق تھا۔ اس نے وہاں سے کولگام جانے کی ٹھان لی کیونکہ وہاں ابھی بھی غنڈوں کے قہر سے پورے علاقے میں خوف و ہراس کا عالم تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے اسے امن و قانون کا بہانہ بنا کر وہاں جانے سے روکنے کی کوشش کی مگر صادق صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ کولگام پہنچا اور وہاں تمام تر حالات کا جائزہ لیا۔ انکے جانے سے وہاں کسی حد تک خوف و دہشت دور ہوا۔ ترولگام کے غریز لالے اور احسن رشی وغیرہ بھی غنڈوں کے حملے سے زخمی ہوئے تھے۔ صادق صاحب ان سے ملا اور اصل حالات کی واقفیت حاصل کی۔ وہ جان گئے کہ اس کانفرنس کو جان بوجھکر ناکام بنانے کیلئے یہ تہمت لگائی گئی تھی کہ یہ امن تحریک کیلئے نہیں بلکہ امن کا بہانہ کر کے یہ کلیتاً مجوزہ اور پروکیشور مینٹ کو ختم کروانے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کیلئے ہے۔ لیکن یہ سراسر غلط تہمت تھی۔ یہ کشمیر کی جمہوریت میں اظہار خیال کی آزادی پر پہلی مگر منحوس چوٹ تھی۔ اس واقعہ کے بعد دانستہ طور پر ہم نے مجوزہ اور پروکیشور مینٹ کی خرابیوں کا پرچار کرنا بھی شروع کیا کیونکہ ترولگام کے واقعہ نے یہ ظاہر ہی کیا تھا کہ حکومت اس معاملے میں جابرانہ رویہ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ہم نے زینہ کوپرہ، جوہن پورہ، وڈورہ، سنگس کہاروٹ وغیرہ دیہاتوں میں اس کے بعد کئی

جلسے کیے اور انھیں مجوزہ اور پروکیور منٹ کے جابرانہ عمل کو روک کر اصولوں اور انصاف کی بناء پر غلہ جمع کرنے کیلئے آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں ایک جلسہ میمندر شوپیاں میں منعقد ہوا۔ جہاں کہ حکومت وقت نے لوگوں کو ہمارے خلاف بدظن کرنے کی کوشش کی۔ میمندر کے ایک دوکاندار نے اپنی دوکان کے سامنے جلسہ منعقد کرنے کیلئے جگہ دی تھی۔ میرے ساتھ اس جلسہ میں عبدالمجید بانڈے شوپیاں اور یاری پورہ کے امیر اللہ خان بھی تھے۔ اس جلسے پر بھی نیشنل کانفرنس کے لیڈروں نے غنڈوں سے حملہ کرواکے اس جلسے کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ ہم کو ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا گیا۔ خوش قسمتی سے دکاندار نے ہمیں دکان کے اندر دھکیل کر غنڈوں کے حملے سے بچایا۔ باہر غنڈے ہمیں گالیاں دیتے رہے اور دکان پر پتھروں کی بارش کرتے رہے۔ ان غنڈوں کا سرغنہ کچھ ڈورہ کا شیخ منصور تھا۔ آخر میں غنڈوں نے مشورہ کیا کہ کچھ وقت گزر جانے کے بعد رات آئیگی اور لوگ نیند کے عالم میں پہنچیں گے وہ دکان کو آگ لگا کر ہم سب کو زندہ ہی راکھ کریں گے لیکن گاگرن کا ایک نیک انسان اسی گاؤں میں تھا۔ اس کو جب ان غنڈوں کی اس سازش کا علم ہوا اس نے یہ خبر شوپیاں جاکر غلام احمد نام کے ایک پولیس انسپکٹر کو دی۔ اس نے بروقت کاروائی کی اور لگ بھگ تیس پولیس اہلکاروں سمیت میمندر پہنچ گیا اور ہمیں جلائے جانے سے بچالیا۔ وہ ہم سے یہ کہکر شوپیاں کے پولیس تھانے گیا کہ ہمیں

مجوزہ کی غلط کاری کیخلاف آواز اُٹھانے کی پاداش میں وہاں سزا دی جائیگی۔ یہ بات جب غنڈوں نے سُنی اُن کو بھی اطمینان ہوا اسطرح اُس نے ہمیں سمندر سے بچا کر نکال لیا۔

اس کے بعد بھی ہم حکومت کے دباؤ کے سامنے نہیں جھکے بلکہ ہم نے زیادہ ہی تندہی سے مجوزہ مخالف تحریک جاری رکھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ترو لگام کی کچھ عورتیں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے یہ گیت گا رہی تھیں ؎

"رشی دیو چھے دوان جیمہ سیٹھ تارے
امنہ مجاہد وارے چھا؟"

یعنی رشی دیو جموں سے کولگام تاریں بھیج رہا ہے یہ جاننے کیلئے آیا امن کے مجاہد صحیح سلامت ہیں یا نہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگانا بھی آسان ہے کہ ہماری تحریک کے ساتھ نہ صرف عام لوگوں کی ہمدردی تھی بلکہ ہمارا ساتھ دینے کیلئے وقت وقت پر آگے بھی آتے تھے۔ لیکن حکومت اس صحت مند تحریک کو اپنے زورِ بازو سے دبانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ لوگوں کی توجہ اصل اقتصادی مسائل سے ہٹا کر وہ انھیں کھوکھلے جذباتی نعروں میں پھانسنے کو ترجیح دے رہی تھی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سعید میر قاسم نے اپنی سوانح حیات میں یہ تحریر کیا ہے کہ پروکیورمنٹ کے وصولنے کے طریق کار کے خلاف اُس نے ہی پہلے پہل آواز اُٹھائی اور اس سے عبدالکبیر متاثر ہوا

جو کہ سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ ہاں اس تحریک کو دبانے میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ ژوالگام کے امن کانفرنس کے جلسہ کو تہس نہس کرانے اور اس کا مجوزہ مخالف نقشہ صادق صاحب کے سامنے پیش کرنے کا رول اس نے مرزا افضل بیگ کے پی۔ اے کی حیثیت سے ہی کیا تھا۔ مجھے آج بھی بالکل یاداشت میں وہ واقعہ محفوظ ہے جب اس نے صادق صاحب کو چکنی چوپڑی باتیں سنا کر جلسے میں شامل ہونے سے روکا تھا۔ اس نے صاف طور سے کہا تھا کہ یہ کچھ ہندوستانی ایجنٹوں اور ہندوؤں کی منڈلی ہے جو ہمارے خلاف کچھ کھچڑی پکا رہے ہیں اور پروکیشور مینٹ کو ختم کرنے کا درپردہ پروگرام ان کا اصل مقصد ہے۔ میر قاسم نے اپنی سوانح حیات میں ان واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے مجوزہ (مالیہ) اور پروکیشور مینٹ کے خلاف لڑائی کو اپنے کھاتوں میں ڈالکر اصل کام کرنیوالوں کو فراموش کیا ہے۔ لیکن حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ میر قاسم ان دنوں عملی سیاست سے دور رہ کر مرزا افضل بیگ کا پی۔ اے تھا۔ اور وہ اپنے آقا کی خواہش کے برعکس "سر دیں گے، سر پلس نہیں دیں گے" کا نعرہ بلند کرنے والے عبد الکبیر کی حوصلہ افزائی کیسے کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ قاسم صاحب اس تحریک کو فرقہ دارانہ لائنوں پر منتشر کرنے اور حکومت کی پالیسیوں کو جبر و زبردستی سے رائج کرنے میں بیگ صاحب کا مشیر اعلیٰ بنے ہوئے تھے۔

بہر حال میمندر کے جلسے کے بعد ہی مجھے نیشنل کانفرنس سے نکالنے کی چالیں چلائی جانے لگیں۔ میں اس دوران بھی نیشنل کانفرنس کے تعمیری پروگراموں کو کامیاب کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔ اس دوران میں نے ریاست سے باہر بھی امن کانفرنس کے کئی جلسوں اور کانفرنسوں میں حصہ لیا۔ ان میں بمبئی، کلکتہ اور جالندھر میں منعقد کی گئی کانفرنسیں قابل ذکر ہیں۔ ان کانفرنسوں میں میرے ساتھ کشمیری زبان کے مشہور ترقی پسند شاعر دینا ناتھ نادم، پروفیسر سومناتھ اپوربھ اور عبدالغنی تمتہ ہالی بھی تھے۔ ادھر نیشنل کانفرنس اپنے نظریئے سے بھٹک کر اب کھوکھلی نعرہ بازی اور بے اصول پالیسیوں کی طرف جا رہی تھی۔ پرخلوص اور ایماندار لوگوں کو نظر انداز کیا جانے لگا تھا۔ مجھ جیسے ورکر جس نے اپنی زندگی شیخ صاحب کے نیا کشمیر پروگرام کیلئے وقف کی تھی، کو حاشیئے پر لگانے کیلئے مختلف ہتھکنڈے اپنائے جا رہے تھے۔

میں اب بھی نیشنل کانفرنس کا حلقہ پریذیڈنٹ تھا۔ مولوی سعید نے نبہ جی کو مجھے اپنے عہدے سے ہٹانے کے کام پر مامور کیا تھا۔ نبہ جی ضلع کھیٹن کے صدر تھے۔ وہ مجھے اپنے عہدے سے ہٹانے کے منصوبے کی عمل آوری کیلئے خود بذات زینہ پورہ آیا۔ اس سے پہلے زینہ پورہ میں ایک واقعہ ہوا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ہر گاؤں کی طرح زینہ پورہ بھی غذائی قلت سے متاثر تھا۔ لوگ روٹی کیلئے پریشان تھے۔ وہاں کے عوام نے

راشن مہیا کرانے کی مانگ منوانے کے حق میں جلوس نکالا۔ میں ان دنوں روپوش تھا۔ کیونکہ میمندر کے واقعہ کے بعد گورنمینٹ نے میرے خلاف وارنٹ نکالی تھی۔ مجھ پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا تھا کہ میں نے ہی زینہ پورہ کے عوام کو راشن نہ ملنے پر جلوس نکالنے کی ترغیب دی تھی۔ نبہ جی زینہ پورہ آیا۔ اس نے سارے حقائق کا پتہ لگایا۔ وہ مطمئن تھا کہ راشن کی نایابی کیخلاف جلوس نکالنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ چھ ہزار لوگوں کا اجتماع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے انتہا پسند کا نام دیکر مجھے حلقہ پریذیڈنٹ کے عہدے سے ہٹانے اور میری جگہ نیا پریذیڈنٹ چننے کیلئے لوگوں کو نام پیش کرنے کیلئے کہا لیکن چھ ہزار لوگوں کے اجتماع نے ایک زبان ہو کر بار بار میرا ہی نام تجویز کیا۔ پھر نبہ جی نے ڈپٹی گیٹ کا نام پیش کرنے کو کہا تو لوگوں نے پھر ایک بار ایک آواز ہو کر میرا ہی نام پیش کیا۔ نبہ جی نے پھر ہزل اور طنز کے طور پر چیپر اسی کا نام تجویز کرنے کیلئے کہا۔ اس پر پھر ایک بار ایک زباں ہو کر اسے دو ٹوک جواب دیا کہ کسی بھی بہانے وہ رشی دیو کو برطرف کر کے کسی چاپلوس کو سامنے لانے کی وجہ نہیں بنیں گے۔ حالانکہ نبہ جی کو پارٹی لیڈرشپ سے مجھے تنظیم سے نکالنے کیلئے صاف ہدایت دی گئی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اور وہاں سے مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔ دراصل میں کسی بڑے لیڈر کے رحم و کرم سے نشنل کانفرنس تنظیم میں ٹکا ہوا نہیں تھا بلکہ مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کا بھرپور تعاون اور ساتھ تھا۔ یہ وہ

زمانہ تھا جب عام لوگوں میں ابھی فرقہ وارانہ منافرت کے بیج نہیں بوئے گئے تھے۔ ابھی مذہب کو سیاست کے ساتھ خلط ملط کرنے کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ آدمی کو قربانی، دیانت داری اور عام لوگوں کی بھلائی کیلئے کام کرنے کے اوصاف سے ناپتے تھے۔

خیر اسکے بعد بھی میں نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں رہا لیکن مجھ جیسے کارکن کو پارٹی لیڈرشپ کم اہمیت دیتے رہے۔ میں بھی لیڈرشپ کی چمچہ گری اور چاپلوسی کیے بغیر پارٹی کے اندر ہی رہ کر عوامی مسائل کیلئے خوب جدوجہد کرتا رہا مگر چونکہ لیڈرشپ شک کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس لئے ہماری آواز کو بے اثر بنایا جاتا تھا۔

1947ء کے بعد میری زندگی میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ میری ملاقات مشہور کامریڈ دھنونتری کیساتھ ہوئی۔ سرینگر میں انکے ساتھ میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں انکے خیالات و نظریات سے بہت متاثر ہوا۔ انکی سیاسی سوجھ بوجھ اور پرکشش خیالوں نے کشمیر میں کارکنوں کی ایک بڑی خاصی تعداد تن اور من سے سیاسی میدان میں اترآنے کیلئے تیار کیا۔ کامریڈ دھنونتری عظیم شہید بھگت سنگھ کے قریبی ساتھی رہ چکے تھے۔ تحریک آزادی کے دوران برٹش سرکار سے انکو سترہ سال معیاد کی جیل کی سزا کاٹنے کیلئے کالا پانی بھیجا گیا تھا۔ مگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہونے سے کچھ سال پہلے ہی انکو رہا کیا گیا تھا۔ دھنونتری کالی جانی جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ انکی

صحت سامراجیوں کے ہاتھوں اُنھیں گوناگوں تکلیفیں دینے کی وجہ سے اکثر خراب رہتی تھی۔ پھر بھی وہ ہمت، لگن اور تن دہی سے دن میں سولہ گھنٹے سیاسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ میں جب جموں آتا تھا تو وہاں بھی اُن سے ملنے میں اُن کی رہائش گاہ پر جاتا۔ جموں میں اُنکے پاس آتے جاتے ہی مجھے کرشن دیو سیٹھی، رام پیارا صراف، غلام رسول آزاد، وید پال دیپ اور مکت جی وغیرہ سے بھی جان پہچان ہوئی۔

بہر حال 1953ء سے پہلے ہی لوگوں کو "نیا کشمیر" کے پروگرام کے مکمل طور روبہ عمل آنے میں غیر یقینی سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اس سے قبل ہی وادی میں سیاسی اُتار چڑھاو نے نیشنل کانفرنس کے عام کارکن کو تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ 1953ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری ہوئی۔ میں اُن دنوں کسانوں کے مسائل حل کرنے کیلئے سرگرمی سے کام کرتا تھا۔ اُوپر کی سیاسی شطرنج بازی کا مجھے اُتنا کوئی علم نہیں تھا۔ مگر مجھے ایک بات اچھی طرح یاد ہے کہ شیخ عبداللہ اور خاص طور پر مرزا محمد افضل بیگ کی تقاریر میں ایک نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ اپنی تقریروں میں ہندوستان اور ہندوؤں خلاف زہر اُگلتے تھے۔ اُن کا لہجہ فرقہ وارانہ منافرت سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بیگ صاحب نے کئی بار اپنی تقریر میں کہا تھا کہ نیشنل کانفرنس کا اصل منشور کشمیری ہندوؤں کو اس طرح اقتصادی بدحالی کا شکار بنانا ہے تاکہ وہ بھی اُسی طرح مسلمانوں کے گھروں میں صفائی، لپائی پتائی، چاول چننے اور بننے

جیسے چھوٹے موٹے کام کرکے گزارہ کرنے پر مجبور ہوں جسطرح کشمیری مسلمان، ہندوؤں کے گھروں میں محنت مزدوری کرکے پیٹ پالتا تھا۔

شیخ صاحب اس سے پہلے نیویارک گئے تھے اور ہم سنتے تھے کہ یہاں بھی اُن کے پاس امریکہ سے کوئی سیٹو نسن آیا تھا جن کے ساتھ شیخ عبداللہ نے کئی گھنٹے تنہائی میں تبادلۂ خیال کیا تھا۔ بہرحال 1953ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری ہوئی اور لوگوں نے اس گرفتاری کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اسی دوران فرقہ پسند لوگوں کو اس واقعہ سے ہندوستان کیخلاف منافرت پھیلا کے عام کشمیری کو اس سے بدظن کرنے کا موقعہ ملا۔ ہم لوگوں کو بھی اس واقعہ سے جوڑا گیا تھا۔ افواہ یہ پھیلائی گئی تھی ہم لوگوں نے ہی پنڈت نہرو کے پاس جاکر اُن سے کشمیر کے حالات بیان کئے ہیں لیکن ہمارے خلاف یہ جھوٹا الزام تھوپنے والے اپنی اِن بُری چالوں کو کامیاب نہیں کرپاسکے اور ایسا اُلٹا کام کرنے میں ناکامیاب رہے۔ کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ اگر میں ریاست سے باہر بمبئی، کلکتہ یا جالندھر وغیرہ جاتا تھا تو صرف امن کانفرنس کے جلسوں اور تقاریب میں شرکت کرنے کیلئے ہی جایا کرتا تھا۔ نہ میں کوئی منسٹر تھا نہ مرکزی سرکار کے سیاسی گلیاروں تک میری کوئی رسائی ہی تھی۔ امن کانفرنس کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے بھی مجھے نیشنل کانفرنس کے بنیادی پروگرام سے خاصی دلچسپی تھی اور میں اس کیلئے خوب کام کرتا تھا۔

شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد جموں و کشمیر کے

پرائیم منسٹر بنے۔ اُنہوں نے ایکبار مجھے اپنے پاس بُلایا اور بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کے عہدے کی پیشکش کی۔ مگر میں نے مُلازمت کی پیشکش قبول نہیں کی۔ میری خودداری نے مجھے مُلازمت میں شامل ہو کر حکومت کے ہر کھرے کھوٹے فیصلہ کیساتھ ہاں میں ہاں ملانے کی اجازت نہیں دی۔ مگر اس سب کے باوجود غلام محمد صادق اور کچھ دیگر کمیونسٹ لیڈروں کے مشورہ سے میں نیشنل کانفرنس تنظیم میں پھر سے سرگرم ہُوا۔ میں نے اب بحیثیت تحصیل پریذیڈنٹ کام کرنا تسلیم کیا۔ بخشی غلام محمد کے دور میں ہی نیشنل کانفرنس تنظیم میں پیس بریگیڈ (Peace Brigade) نام کا رضاکارانہ فورس قائم ہُوا تھا جسکا مقصد غنڈہ گردی اور دُوسری سیاسی ہُلڑبازیوں سے وابستہ دُوسری آوازوں کو دبانے کا کام انجام دینا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ فورس بخشی غلام محمد نے اپنی اتھارٹی قائم کرنے اور ہر مخالف آواز کو دبانے کیلئے استعمال کیا۔ میں اس آفت جان تنظیم سے دُور رہتے ہوئے اور اسکے قہر سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نیشنل کانفرنس تنظیم میں رہا اور اس دوران میں نے لوگوں کی بھلائی کیلئے کچھ کام حکومتِ وقت سے کروائے۔ اور کاموں کے علاوہ کچھ نہریں کھدوانے کا کام بھی میری ہی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ نہریں کھدوانے کے کاموں میں ریشی پورہ نہر، رکھ کلتر نہر، اور منلہ آورہ نہر شامل ہیں۔ زینہ پورہ نہر کھدوانے کیلئے 1953ء سے پہلے ہی میں شیخ عبداللہ کے پاس کئی وفود لیکر گیا تھا اور اُسے اس بات پر راضی کیا تھا۔ اس

طرح شیخ صاحب کی پرائم منسٹر شپ میں میری کوششوں سے زرینہ پورہ نہر بنائی گئی جس کی بدولت اس علاقے کے درجنوں دیہاتوں کی خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ 1953ء کے بعد کئی مقامات پر کئی سکول اپ گریڈ کروائے اور ساتھ ہی کچھ نئے سکول بھی کھلوائے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں کچھ ہسپتال اور ڈسپنسریوں کا قیام بھی میری ہی کوشش سے عمل میں لایا گیا۔ میری ہی دوڑ دھوپ سے علاقے بھر کی کئی سڑکوں کو پختہ بنایا گیا۔ عوامی فلاح و بہبود کے ان کاموں کے علاوہ میں نے اسی دوران مختلف کانفرنسیں اور کنونشن بھی منعقد کروائے جن میں سیاسی کارکنوں کو سیاسی حالات کی جانکاری اور عمل آوری کی تربیت بہم پہنچائی گئی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں نے عوامی بہبود کے یہ سب کام بچولیوں اور ٹھیکیداروں کے استحصال کے بغیر کروائے۔ مثلاً نہر کی کھدائی کا گورنمنٹ ریٹ 17 روپے فی ہزار فٹ تھا جبکہ ٹھیکیدار مزدوروں کو صرف 7 روپے فی ہزار فٹ دیتا تھا۔ اسطرح ایک ہزار فٹ میں ٹھیکیدار کی جیب میں پچاس فیصد سے بھی زیادہ رقم چلی جاتی تھی۔ میں نے ایسے کام کروانے کیلئے گاؤں کے لوگوں کو منظم کیا۔ اور بغیر کسی ٹھیکیدار کے ہی ہم نے ایسے کئی کام خود گاؤں والوں سے ہی کروائے۔ اس سے گاؤں کے لوگوں کو اپنے کام کے بدلے اچھا خاصا معاوضہ بھی ملتا تھا اور کام بھی ایمانداری کیساتھ ساتھ صحیح ڈھنگ سے ہو پاتا تھا۔

ایسی نہروں میں رشیشی پورہ نہر کا نام قابلِ ذکر ہے، جسکی کھدائی کا کام گاؤں کے لوگوں نے مل جل کر کیا ہے۔

اسی طرح زینہ پورہ جیسے دیہات کیلئے، جہاں سے جنگل بہت دور ہے، جنگلی لکڑی کی فراہمی ایک اہم مسئلہ بنا رہتا ہے۔ میں نے ایک بار بخشی غلام محمد کے پاس جاکر انکے سامنے ایک تجویز رکھی تھی کہ پرمٹ سسٹم کے بجائے اگر مختلف دیہاتوں میں بھی کچھ لکڑی کے ڈپو کھولے جائیں تو ضرورت مند پرمٹ سسٹم کے چکر اور رشوت خوری سے بچ جائیں گے۔ انھوں نے تو میری اس بات سے اتفاق کیا لیکن ان کے اردگرد بخشی رشید اور دیگر ایسا ٹھیکہ دار طبقہ تھا جن کو میری بات بہت بری لگی اور وہ ناراض ہوگئے۔ اور اسطرح وہ اندر ہی اندر مجھے حاشیے پر لگانے کی راہیں ڈھونڈھنے لگے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ مجھے اپنے لوٹ کھسوٹ کے راستے کا کانٹا تصور کرنے لگے لیکن میں اپنے علاقے کی تعمیر نو اور ترقی کے کاموں میں بے لوث جذبے کے تحت تن دہی سے لگا ہی رہا۔

میں نے سیاسی کیمپ کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کیمپوں میں، راقم سیاسی کارکنوں سے سردار جعفری، کرشن چندر، میکسم گورکی اور لینن وغیرہ دانشوروں و عالموں کی انسان دوستی اور غریب پروری کے خیالوں سے لبریز تصانیف پڑھنے کی تلقین کرتا تھا تاکہ وہ جمہوری اقدار سے بخوبی واقف ہو جائیں ایک

دو سال کے بعد جب بخشی رشید نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے بخشی صاحب کو مجھ جیسے لوگوں کی ضرورت کم محسوس ہونے لگی۔ ایک بار بخشی رشید اور شمس الدین نے کولگام آکر ڈیلی گیٹوں سے ببانگ دہل یہ ہدایت دی کہ ہیپیس بریگیڈ کی سرپرستی کے بغیر سیاسی کام کرنیوالوں کو انکی پارٹی برداشت نہیں کریگی۔ بخشی رشید کے منظورِ نظر اور جی حضوری کرنیوالے ہی اصلی کارکن سمجھے جاتے تھے۔ وہ لوگ جن کی انفرادی سوچ تھی۔ انھیں وہ اپنا دشمن تصور کرتا تھا، کیونکہ اُن کو لگتا تھا کہ اسے انکی خاندانی حکومت کی جڑیں مستحکم ہونے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اس دور میں سیاسی غنڈہ گردی کا ڈنڈا اور سیاسی کرپن کے چلتے ہوئے بھی اونچی تعلیم تک مفت تعلیم، سکولوں، کالجوں کا قیام اور سڑکوں و پلوں کی تعمیر وغیرہ جیسے تعمیری پروگرام عملائے گئے۔ مگر بخشی صاحب سیاسی کارکنوں کو تربیت دینے یا عوام کو صحیح سیاسی حالات سے واقف کرانے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس دور میں غلام محمد صادق کی کوششوں سے سیاسی تربیت دینے کے کیمپ منعقد ہوتے تھے۔ لیکن نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ انکو ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دور کی لیڈرشپ نے جان بوجھکر چاپلوسوں و مفاد پرستوں کو نیشنل کانفرنس میں اہم جگہ دی اور محب وطن و سیاسی طور پر بیدار عناصر کو ایک ایک کر کے نیشنل کانفرنس سے نکال باہر کیا گیا۔ چونکہ میں نے بھی بخشی غلام

محمد کے اردگرد منڈھرا رہے ان چاپلوسوں کے درمیانہ داری اور ٹھیکیداری کی تمام تر تجاویز کی بے حد مخالفت کی تھی جو ایک سیاسی کارکن کو سیاست سے الگ کر کے ذاتی وفاداریوں کے جنگل میں پھنسا دیتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مجھے بھی نیشنل کانفرنس کے تحصیل صدر کے عہدے سے ہٹا یا گیا۔

اسی دوران سیاسی غنڈہ گردی سے تنگ آکر غلام محمد صادق بھی نیشنل کانفرنس سے الگ ہوئے اور انھوں نے جمہوری نیشنل کانفرنس تنظیم قائم کی۔ جس نے کچھ مدت تک حزب مخالف کی صحت مند جمہوری روایات کو قائم کرتے ہوئے عوام کے جائز حقوق کی ترجمانی کی لیکن بعد میں کچھ اقتدار کی ہوس اور کچھ مرکزی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے صادق صاحب پھر بخشی غلام محمد کی گود میں چلے گئے۔

مجھے میرے عہدے سے ہٹانے کی ایک اہم وجہ میرا نام تھا۔ چونکہ میں ایک ہندو تھا۔ بس یہی میرا ہندو ہونا مجھے اسمبلی رکنیت یا منسٹر کی کرسی اور مجھ جیسے بہت سارے پرخلوص سیاسی کارکنوں کیلئے ایک منفی صلاحیت تصور کی جاتی تھی کیونکہ 1956ء کا برٹش سرکار کا کمیونل ایوارڈ کسی نہ کسی صورت میں آج تک پورے ہندوستان اور خاص طور پر کشمیر میں مستحکم طور پر رائج ہے۔ میرے کئی شاگرد میر قاسم کے زمانے میں منسٹروں کی کرسیوں پر فائز ہوئے اور صادق صاحب جو کہ ایک بلند خیال، دیانتدار، سوشلسٹ، اور وطن دار

وطن دوست آدمی تھا۔ اُس نے بھی بڑے بڑے سرمایہ داروں مثلاً برزہ خاندان کے لوگوں اور تیرتھ رام کو اسمبلی وغیرہ میں لوگوں کی نمائندگی کرنے کا موقعہ دینے میں ساتھ دیکر غریب اور پُرخلوص سیاسی کارکنوں کو نظر انداز کیا۔

بہرحال کچھ مدت کے بعد کامراج پلان کے تحت بخشی غلام محمد کو استعفےٰ دینا پڑا اور شمس الدین اس کے جانشین مقرر ہوئے۔ اُسکی وزارت میں موئے مقدس کے چرائے جانے کا ڈراما رچایا گیا۔ در حقیقت موئے مقدس کو اپنی جگہ سے اُٹھا کر کہیں رکھوا دیا گیا تھا چوری کیخلاف وادی کے اطراف و سکنات میں زبردست ہنگامے اور احتجاج ہوئے۔ لوگوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ پڑی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ ایسی منحوس حرکت پر ناراض تھے۔ بڑی مشکل سے موئے مقدس برآمد ہو گیا لیکن ابھی تک بھی اصلی چور کا پتہ نہیں چل سکا۔ "اصلی ملزم کو پیش کرو" نعرہ اخباروں کی سُرخی بن کر رہ گیا۔ موئے مقدس کو اپنی مقررہ جگہ پر واپس لانے میں مرکزی حکومت کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔

بخشی دور کی غنڈہ گردی اور رشوت خوری کے سبب جمہوری روایات کی دھجیاں اُڑائی گئیں۔ اسکے ردِ عمل میں 1957ء میں ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس نام کی تنظیم کا قیام وجود میں آیا۔ اس تنظیم کا اہم مقصد جمہوری قدروں اور سماجی انصاف کی بحالی کیلئے ایک

صحت مند حزبِ اختلاف کا رول نبھانا تھا۔ میں بھی بذاتِ خود اس تنظیم میں شامل ہوا۔ مجھے اپنی تحصیل کے یونٹ کا پریذیڈنٹ اور پراونشل کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ڈی۔ این۔ سی میں رہتے ہوئے ہم نے بہت سی جگہوں پر جلسے جلوس منعقد کروائے۔ جن کا مقصد حکومت کی غلط پالیسیوں کی طرف عام لوگوں کی توجہ مبذول کرانا تھا۔ اس دوران ہمیں سپیس بریگیڈ کے حملے بھی برداشت کرنے پڑے۔ میں نے زینہ پورہ میں ایک جلسہ صادق صاحب کی قیادت میں کرایا۔ جس میں حکومت کی طرف سے کافی دباؤ کے باوجود بھی لگ بھگ بیس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ اس زمانے میں، میں نے بڈگام، کولگام وانت ناگ کی تحصیلوں میں بھی ڈی۔ این۔ سی کیلئے کام کیا اور کبھی کبھی جموں صوبے میں بھی اس تنظیم کی جدوجہد میں شامل ہوا۔ سپیس بریگیڈ کے لوگ اکثر ہمیں ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے لیکن پھر بھی ہم غیر متزلزل رہ کر اپنے جمہوریت کی بحالی کے مشن کو آگے ہی آگے لیجاتے رہے۔

شاید 1962ء کا زمانہ تھا۔ صادق صاحب نے ہم لوگوں کے ساتھ مشورہ کیے بغیر ہی بخشی رشید کی نیشنل کانفرنس میں دوبارہ شمولیت کی۔ یہ فیصلہ ڈوگرہ صاحب، ڈی۔ پی۔ ڈر، میر قاسم اور خود صادق صاحب کا تھا۔ ادھر ہم لوگ جو اپنے لوگوں کو اس بات کیلئے خبردار کر رہے تھے کہ ڈی۔ این۔ سی کی تحریک سیاسی استحکام کیلئے اور غنڈہ گردی اور رشوت

خوری کیخلاف ہے۔ لوگوں کے سامنے لاجواب ہوئے۔ ڈی۔ این۔
سی عوامی مسائل حل کرنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کیلئے ہی
معرض وجود میں آئی تھی لیکن جب اس تنظیم کے روح رواں نوں
نے ہی حکومت وقت سے اقتدار کی بھوک کی وجہ سے ہاتھ ملایا۔
ہم بے بس ہو گئے۔ صادق صاحب نے مجھ پر بھی نیشنل کانفرنس میں
شامل ہونے کیلئے دباؤ ڈالا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی صادق صاحب
کی زور و زبردستی سے اس تنظیم میں واپس لوٹ آیا۔ لیکن تب
تک پارٹی کے اندر کی پالیسی میں اور بھی ابتری آئی تھی۔ ادھر کوئی
دوسرا پلیٹ فارم بھی نہیں تھا، جسکے ذریعے عوامی مسائل کو حکومت
کے سامنے لایا جاسکتا تھا۔ اس طرح صادق صاحب کے کہنے پر مجھے نیشنل
کانفرنس میں پھر سے شامل ہونا پڑا۔ مگر بخشی رشید کی غنڈہ گردی سے
پہلے سے ہی مجھے اختلاف تھا۔ اس لئے وہ بعد میں بھی ہمیں کوئی بھی
اہمیت نہ دینے کے اپنے پرانے رویے پر ڈٹا رہا۔ پارٹی فورم میں
ہماری کسی بات کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ حوصلہ افزائی کے
بدلے مجھ جیسے کارکن اور میرے جیسے کارکنوں کیخلاف مذہبی منافرت
اور تنگ کرنے کی پالیسی اب زیادہ ہی زور و شور سے جاری رکھی گئی۔

اسی دوران سنہ 1965ء کی پاکستانی دراندازی شروع ہوئی
یہ وقت ملک کی سالمیت کی خاطر کچھ کرنے کا وقت تھا۔ سارے اختلاف
بھلا کر میں دراندازوں کے برے ہتھکنڈوں کیخلاف لوگوں کو صف آرا

کرنے پر کمر بستہ ہو گیا۔ میں تحصیل شوپیاں کے اکثر دیہاتوں میں لوگوں کو دشمن کی چالیں ناکام بنانے کیلئے منظم اور متحد کرتا رہا۔ کلرس پورہ، مجہ پتھری، رام نگری اور شادی مرگ کے علاقوں میں ہم نے لوگوں کو ساتھ ساتھ اور ایک جٹ رہنے کیلئے جلسے منعقد کروائے۔ یوں مرگ کے جنگلوں سے دراندازوں کا آنا سہل و آسان تھا۔ میں کئی بار سیکیورٹی ساتھ رکھکر یا اکیلے جان جوکھوں میں ڈالکر دراندازوں کے اس علاقے میں گھسنے میں لوگوں کو ساتھ لیکر روکاوٹیں پیدا کرتا رہا۔ دراندازکھدیڑے گئے۔ کشمیری عوام نے ایکبار پھر پاکستان کے برے ہتھکنڈوں کا اپنے اتحاد اور بھائی چارے کے بل بوتے پر منہ توڑ جواب دیا۔

کچھ مدت کے بعد اسمبلی کا چناؤ تھا۔ اس سے پہلے ہی صادق صاحب کی قیادت میں پورے کشمیر میں کانگریس پارٹی کی بنیاد پڑ چکی تھی اور میں بھی اس پارٹی کے ساتھ تھا۔ مجھے شوپیاں تحصیل کا کانگریس پریذیڈنٹ بنایا گیا۔ اب جبکہ اسمبلی الیکشن کیلئے ٹکٹیں بانٹنے کا وقت آیا تو میں یہ دیکھکر حیران ہو گیا تھا کہ صادق صاحب کی لیڈرشپ میں ایسے لوگوں کو بھی ٹکٹیں دی گئیں تھیں جن کی نشاندہی 1965ء کی دراندازی کے وقت ان دراندازوں کی راہنمائی کرتے ہوئے کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حلقہ بڈگام سے کانگریس کا امیدوار صادق علی تھا جو نہ تو کانگریس کا نہ ہی نیشنل کانفرنس کا ہی رکن تھا بلکہ اس کے

پاس یہی ایک سند تھی کہ وہ دراندازوں کی رہنمائی میں نام کما چکا تھا۔ حلقہ کیمو سے عبدالرحمان ڈار کو کانگریس امیدوار کے طور پر کھڑا کیا گیا جو بنیادی طور پر جماعت اسلامی کی سیاست کا ہمدرد تھا۔ دونوں جگہوں پر یعنی بڈگام میں دیرینہ کارکن عبدالرحمان راحت اور کیمو کے مخلص سیاسی کارکن امیر اللہ کو نظر انداز کیا گیا۔ یہی حال حلقہ بدل کا تھا جہاں سے ایک بلاک افسر کو جو دراندازوں کو تباہی و بربادی پھیلانے میں ساتھ دیتا تھا اور مدد کرتا تھا، ہنڈ ڈیٹ دیا گیا۔ ظاہر ہے ایسے حالات و خیالات کے پیش نظر راقم کا نام آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے کبھی کمیونسٹ، کبھی بٹہ (ہندو) کا خطاب دیتے ہوئے نظر انداز کرنے کا جواز دیا گیا۔ کانگریس کے اس فیصلہ کے خلاف ہمارے علاقے میں کئی وفود غلام محمد صادق، میر قاسم اور ڈی۔ پی۔ دھر سے ملے مگر انکی کوئی بھی شنوائی نہیں ہوئی۔ اب میں نے خود کو ہر سطح پر سرگرم رہنا مشکل پایا۔ کیونکہ ہندو نام کی بیڑیاں مجھے سیاست کے ہر محاذ پر آگے چلنے میں سد راہ ثابت ہوئیں۔ میرے دل کو چوٹ پہنچا رہی تھی۔ آخر کار میں نے کانگریس کی تحصیل صدارت اور صوبائی کمیٹی سے استعفےٰ دینا ہی بہتر سمجھا۔ کیونکہ کشمیر میں اب سیکولر سیاست کیلئے یہاں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ بلکہ تعصب پرست اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے

لوگوں کی سیاسی تنظیموں پر گرفت مضبوط ہوا کرتی تھی۔ اور ریاست کو اندر اندر سے جمہوریت پسند ہندوستان سے الگ کرنے کی کوششیں تیز سے تیز تر ہو گئی تھیں۔ اب میرے سامنے خالص کمیونسٹ پارٹی ہی ایسی پارٹی تھی جس پر نام و نظریہ کے لحاظ سے سیکولر لیبل تھی۔ کانگریس سے نکل کر میں اس پارٹی میں شامل ہوا۔ اور اسی پارٹی کے رکن کی حیثیت سے میں نے ممبر اسمبلی کا فارم بھر دیا جو کہ اس بہانے رد کیا گیا کہ میں نے ہندیونین کی وفاداری کا حلف نہیں لیا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ اور بھی کئی لوگوں کے فارم اسی جھوٹے بہانے سے رد کیے گیے کیونکہ کانگریسی لیڈرشپ کو اپنے لوگوں کو بلا مقابلہ کامیاب کرانا مطلوب تھا۔

اسی دوران گاؤں گاؤں اور محلوں محلوں میں جماعت اسلامی کے سکول کھولے گئے تھے۔ جن کے ذریعے بنیاد پرستی کو فروغ مل رہا تھا۔ اور وادیٔ کشمیر سے للیشوری (للہ عارفہ) اور شیخ نور الدین ولی کے بھائی چارہ کے مساواتی تصور کو مٹانے کی سرگرم کوششیں چل رہی تھیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی رجعت پسند اور سامراج نواز طاقتیں اور تنظیمیں ان سکولوں کی ترقی اور ان کی بنیاد پرستی کی تبلیغ کو چلانے کیلئے اندرون وطن ملک دشمن عناصر کے ذریعے کافی رقومات بہم پہنچاتی تھیں۔ وادی کے نام نہاد سیکولر سیاسی لیڈر اور سٹیٹ پاور ان سب باتوں کا تماشہ دیکھ رہے

تھے عین تماشہ بینوں کی طرح۔ وہ ان سب واقعات سے اوپر اوپر سے سطحی طور لاتعلقی دکھلا کر ان سنی اور ان دیکھی کر رہے تھے لیکن اندر ہی اندر ان قوتوں کی دانستہ اور غیر دانستہ طور پر حوصلہ افزائی کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کر کے میں نے کسان محاذ پر بحیثیت جنرل سیکرٹری کام کیا لیکن ایک دو سالوں کے اندر ہی کمیونسٹ پارٹی کا اصلی چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ میری دلچسپی کامریڈ دھنونتری سے ہوئی ملاقاتوں کے دوران ہی بڑھ گئی تھی لیکن ان دنوں نیشنل کانفرنس اور سوشلسٹ نظریے میں ایک لحاظ سے مماثلت تھی۔ کیونکہ نیشنل کانفرنس کا "نیا کشمیر" پروگرام بھی سماجی انصاف اور غریب پروری پر مبنی تھا۔ جو بعد میں موقعہ پرست اور فرقہ پرست سیاست سے کند پڑ گیا۔ لیکن بعد میں جب میں نے اپنی ریاست کی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت کی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں بھی انہی پیشوں کو ترجیح دی جاتی ہے جن سے سماجی انصاف کی عظیم روایت کو چوٹ پہنچے۔ ہندو مسلم منافرت نے اس پارٹی کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہ پارٹی صرف نام کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ مگر یہاں کا ہر طور و طریقہ کانگریس کا ہی جیسا تھا۔ یہاں بھی کارکن کی ذاتی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اسکی اہمیت کو مذہب کے پیمانوں سے تولا اور آنکا جاتا تھا۔ کمیونسٹ

پارٹی کے لیڈر بھی ویسے جابرانہ اور بے اصولانہ سیاست کھیلتے تھے۔ جس سے اُنکے ذاتی مفادوں کی آبیاری ہوتی تھی۔ اور وطن اور قوم کے مفادات کو بالائے طاق رکھا جاتا تھا۔ وادی کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر عبدالستار رنجور کے متعلق مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ اُس کے علاقے میں عبدالکبیر نام کا ایک کاشتکار تھا۔ اُسکو زمین سے زبردستی بے دخل کیا گیا کیونکہ یہ زمین عبدالستار رنجور کو خریدنی تھی۔ میں نے اس منحوس قدم کو کمیونسٹ ایڈیولوجی کے بالکل اُلٹ اور خلاف سمجھا۔ اس کے بعد میں اس پارٹی میں بھی زیادہ سرگرم نہیں رہا۔ اُن دنوں کمیونسٹ زیڈ۔ اے۔ احمد کشمیر کے انچارج پارٹی تھے۔ میں نے اپنی پارٹی کے لیڈروں کی ان کالے کرتوتوں کی داستان اُن کے گوش گزار کی۔ لیکن وہ صاحب یہ سب سُن کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ رنجور کے کچھ قریبی لوگ لکڑی کی سمگلنگ کے دھندے میں بھی ملوث تھے۔ یہ بات بھی میں نے اُن کو بے باکی سے سُنائی لیکن اُس کے رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کہ اُن کو میری کھری کھری باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔

1979ء میں سُرجیت سنگھ صاحب جب سی پی ایم کی شاخ کو کشمیر میں قائم کرنے کی غرض سے کشمیر آئے تو اُنھوں نے مجھے سرینگر بُلایا۔ وہاں مجھ سے یہ کہا کہ میں نے ساری عمر کسانوں کے مسائل حل کرنے اور فرقہ پرستی کے بجائے سیکولر

سیاست کو فروغ دینے کیلئے وقف کی ہے۔ اس لئے مجھے انکی پارٹی میں سرگرمی سے حصہ لینا چاہیئے۔ انھوں نے مجھے کسان محاذ پر کسان تحریک کا وائس پریذیڈنٹ مقرر کیا۔ مجھے ترچپر کیرالا اور بعد میں مدنا پور بنگال کے کسان کنونشن میں شرکت کیلئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ میں نے ان کنونشنوں میں اپنا پیسہ خرچ کر کے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ایک اور دفعہ مجھے دہے وادہ میں منعقد ہوئے کمیونسٹ کنونشن میں بحیثیت آبزرور (Observer) مدعو کیا گیا۔ وہاں بھی میں اپنے خرچے سے گیا کیونکہ اب مجھے 1972ء سے فریڈم فائٹر پینشن ملتی تھی لہذا میں ان کانفرنسوں میں آسانی سے آجا سکتا تھا۔

جسطرح نیشنل کانفرنس کیساتھ لوگ اب صرف پیسہ کمانے اور عام لوگوں کے دلوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت کی آگ پھیلانے کیلئے آنے لگے۔ اسی طرح کمیونسٹ پارٹی کے لوگوں نے وادی میں اپنی الگ دوکان کھول رکھی تھی۔ انھیں سیاسی بیداری لانے یا عوام کے مسائل کی طرف توجہ دینے کیلئے نہ وقت تھا نہ دلچسپی رہی تھی۔ کچھ سال یہ حالت زار دیکھکر میں نا امیدی کے عالم میں لگ بھگ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد میں اپنے ہی گھر کی حدود میں رہ کر اپنے آبائی پیشے کھیتی باڑی میں زیادہ وقت گزارنے لگا۔ مجھے لگا کہ جس مقصد کے حصول کیلئے

میں نے اپنی جوانی کے سنہری دن صرف کیے تھے وہ اندھیری راہوں میں نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ میں سی۔پی۔ایم یا دوسری نام نہاد سیکولر تنظیموں کی دعوت کے باوجود اس سارے جھمیلے سے دور خود غرضی اور کنبہ پروری کا انتشار بھرا کھیل تماشائی بن کے دیکھتے رہا۔ ہندوستان کی سیکولرازم کا دعوے کرنیوالی سیاسی جماعتیں اور مقامی گورنمنٹ کرسی کے کھیل میں ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں ریاست میں باہر کی قوتوں کے ذریعے پیدا کردہ عدم استحکام کو روکنے کیساتھ بھی کوئی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بس ایک عجیب دوڑ ہی زندگی کا مقصد رہ گیا تھا۔ کرسی کی دوڑ، پیسے کی دوڑ، چاہے اس دوڑ میں جمہوری اقدار، اقلیتوں، کمزوروں یا غریبوں کو مسلنا ہی کیوں نہ پڑتا۔

مجھے صادق صاحب کے زمانے میں یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ میر قاسم صادق صاحب کو عام کارکنوں سے الگ رکھکر پارٹی میں اپنے منظورِ نظروں اور وفاداروں کو جمع کرنے لگے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب صادق صاحب چیف منسٹر تھے تو میر قاسم نے تیس سے زیادہ ممبران اسمبلی کو صادق صاحب کیخلاف اور اپنے حق میں کرکے دلی تک فریاد کرنے بھیجے۔ اُس وقت ہندوستان کی پرائم منسٹر اندرا گاندھی جی تھیں۔ وہ کشمیر کے کانگریسی لیڈروں کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ میر قاسم کو یہ شکایت تھی کہ غلام

محمد صادق نے شیخ عبداللہ کو رہا کر کے اُس کے ساتھ آزادانہ (Liberalise) پالیسی روا رکھی تھی۔ مگر اندرا گاندھی جانتی تھی کہ ان اسمبلی ممبروں کی اکثریت خالق میڈ ممبروں کی تھی۔ جو کہ سیاست مُلک و قوم کے ساتھ بہت دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس نے ان ممبروں کو اپنا سامنہ لیکر واپس بھیجا۔ اُس نے انھیں یہ بھی کہا کہ خالق میڈ اسمبلی ممبر اقتدار کے بارے میں اہم فیصلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ خالق میڈ کا مطلب یہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر انت ناگ شری عبدالخالق کی مدد سے ان اسمبلی ممبروں میں کچھ ایک کو بلا مقابلہ اور کچھ ایک کو بلا مخالفت الیکشن میں دھاندلی کر کے کامیاب کرایا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ اس چناؤ میں مقابلہ کے دوسرے اُن اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی رد کرائے گئے تھے جو قاسم صاحب کے منظورِ نظر نہیں تھے۔ یہ کاغذات اس بہانے رد کرائے گئے تھے کہ انکو کہا گیا تھا کہ انھوں نے ہند یونین کے آئین کے مطابق بیان حلفیہ دائر نہیں کیے تھے۔ میرا فارم بھی اسی بہانے رد کیا گیا تھا۔ صادق صاحب کے اقتدار کے آخری سالوں میں میر قاسم نے اُسکے حامی کانگریسی کارکنوں کو کانگریس کی تنظیم میں کام کرنا ناممکن بنایا تھا۔ آخری دنوں میں صادق صاحب بھی میر قاسم کی چال کو سمجھ گئے تھے کہ کسطرح وہ مخلص کارکنوں کا قافیہ تنگ کر کے تنظیم کے اندر اپنے چاپلوسوں

کو جمع کرتے ہوئے اپنے لیئے وزیرِ اعلیٰ کی کرسی تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔ مجھے صادق صاحب واصلِ حق ہونے سے کچھ وقت قبل جموں میں ملے۔ اس آخری ملاقات میں اُس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کس طرح کانگریس کی تنظیم کو موقعہ پرستوں کے ہاتھوں میں دینے کیلئے قاسم صاحب کی سازشوں کا شکار ہوئے۔ اس نے اس ملاقات میں حالات کو قابو کرنے اور تنظیم کی لگام نئے سرے سے اپنے ہاتھوں میں لینے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ اُس نے مجھے بھی کانگریس میں سرگرمی سے حصہ لینے کی تلقین کی مگر اس ملاقات کے تھوڑے دن بعد ہی وہ بیمار ہوئے اور چنڈی گڑھ میں آخری سانس لی۔

غلام محمد صادق کے انتقال کے بعد میر قاسم وزیرِ اعلیٰ بنے۔ اُس نے سیاسی سطح پر جماعتِ اسلامی کی کھلی حوصلہ افزائی شروع کی۔ اُس کے زمانے میں ہی جماعتِ اسلامی کے چار پانچ اسمبلی ممبر اُنکی ہی حوصلہ افزائی سے کامیاب ہوئے۔ مثلاً نانڈی حلقہ میں کانگریس اُمیدوار چھ ہزار ووٹ حاصل کر کے الیکشن ہار گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ پارٹی کے اس آفیشل اُمیدوار کے خلاف میر قاسم نے اپنے ایک رشتہ دار کو الیکشن میدان میں اُتارا۔ اُسکی چناؤ مہم میں کانگریس کے کچھ کارکنوں کو بھی لگا دیا۔ کافی روپیہ خرچ کرنے پر بھی اُس نے صرف دو ہزار ووٹ کانگریس کے ووٹوں سے کاٹے جبکہ جماعتِ اسلامی کا اُمیدوار سات ہزار ووٹ لیکر کامیاب ہوا۔ اس

طرح جماعتِ اسلامی کو فائدہ پہنچانے کیلئے میر قاسم نے ہی کانگریس کے ووٹ تقسیم کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ میر قاسم کے دور میں ہی جماعتِ اسلامی انتظامیہ کے صفوں میں ہندوستان دشمن عنصروں کو بھرتی کرانے میں کامیاب ہوئی تاکہ ریاست سے قومی تحریک کے عنصروں کی آواز دبائی جائے۔

صادق صاحب کچھ خامیوں کے باوجود سیاسی طور پر بیدار شخص تھے۔ وہ سیاسی کارکنوں کی سیاسی تربیت کیلئے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ انکی ہی کوششوں سے 1948ء و 1949ء میں وادی میں کئی جگہوں پر سیاسی سکول کھولے گئے جن میں سیاسی کارکنوں کو تربیت دی جاتی تھی۔ ایسے دو سکول مجاہد منزل سرینگر اور ملتنگ پورہ پلوامہ میں کھولے گئے تھے، جن میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ ایک اچھا اور مفید تجربہ تھا۔ لیکن بعد میں مرزا افضل بیگ اور غلام محمد بخشی نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کے بدلے حوصلہ شکنی ہی کی اور یہ سکول پھر بند ہوئے۔ خود صادق صاحب اپنے اقتدار کے زمانے میں قاسم صاحب کو غیر ضروری اہمیت دیکر نادانستہ طور پر ان جمہوری اصولوں اور آدرش کو مسل گئے جو ایک زمانے میں انکو بہت پیارے تھے۔ آخری ایام میں وہ پوری طرح میر قاسم کی گرفت میں تھے اور یہ دیکھکر میں ان سے بھی پوری طرح نا امید ہوا تھا۔

ہندوؤں کے خلاف منافرت پھیلانے کی برسر اقتدار

ٹولی کی پالیسی کو میر قاسم کے زمانے میں منظم طور پر فروغ دیا گیا۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ زمینہ پورہ کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں صوفی پورہ آباد ہے۔ جہاں مسلمانوں کے حنفیہ فرقے کے علاوہ احمدی فرقے کچھ گھر بھی آباد ہیں۔ اس گاؤں کا نمبردار حنفیہ فرقے کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ لیکن گاؤں والوں کو اُسکے خلاف سنگین شکائتیں تھیں وہ اسکو بدل کر احمدی فرقے کے ایک آدمی کو نمبردار بنانا چاہتے تھے۔ نمبردار اننت ناگ ضلع کے کانگریس پریذیڈنٹ کے پاس گیا اور اُسے آٹھ سو روپے نقدی اور گھی کا ایک ٹین دیکر اپنے حق میں کر دیا۔ اب جسطرح ضلع صدر صاحب نے اس نمبردار کی برقراری کیلئے جو وکالت کی وہ دلچسپ تھی۔ اُس نے گاؤں کے حنفیہ مولویوں کو احمدیوں کیخلاف کر دیا اور اُن سے کہلوایا کہ اگر ندی میں کہیں کتا پانی پیتا ہو تو پائین میں کہیں کوئی بھی آدمی اپنی پیاس بجھانے کیلئے پانی پی سکتا ہے لیکن کتے کی بجائے اگر کوئی احمدی پانی پیتا ہو تو حنفی لوگوں پر وہ پانی حرام ہے۔ اس طرح اس معاملہ کو طول دیکر احمدیوں کے گھروں کو آگ لگوانے اور انھیں جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دلوائی گئیں۔ میں اُن دنوں کانگریس کا بلاک صدر تھا۔ احمدیہ فرقے کے کچھ بزرگ لوگ فریاد لیکر میرے پاس آئے۔ میں نے بحیثیت کانگریس بلاک صدر ایس۔ پی اننت ناگ سے گزارش کی کہ وہ گاؤں سے دونوں فرقوں کے کچھ بزرگ

افراد کو بلا کر آپس میں صلح صفائی کروائے۔ کیونکہ ممبر داری کے مسئلہ کو اس طرح منافرت کا باعث بنانا باعث تشویش تھا۔ حنفیوں کے رویے سے زینہ پورہ کے کشمیری پنڈت بھی گھبرا گئے تھے۔ انھوں نے اپنے ڈر کا اظہار وفد کی صورت میں ان دلوں کے ڈی سی انت ناگ مصطفےٰ خان کے پاس کیا لیکن ڈی سی ان کو تحفظ کی یقین دہانی کے برعکس ان پر اس طرح برس پڑے جیسے کہ انکو اپنا ڈر تک اظہار کرنے کا بھی حق نہیں تھا۔ اسی اثنائیں صوفی پورہ کے کچھ حنفیہ لوگ ضلع کانگریس صدر کے پاس میری اس بات کی مخالفت کرنے کیلئے لئے گئے کہ میں دونوں فرقوں کے مابین صلح صفائی کا خواہاں تھا۔ ضلع صدر نے یہ باتیں سنیں اور وہ اس بات پر آگ بگولا ہو گیا کہ ایک ہندو نے مسلمانوں کے مسئلہ میں دخل اندازی کی ہے۔ حالانکہ میرے لئے یہ محض ایک تنظیمی مسئلہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا مسئلہ۔ ضلع صدر نے دو آدمیوں (ایک عبدالرشید ساکنہ چترا گام اور دوسرا غلام قادر بابا ساکنہ بابا پورہ) سے یہ بات بھی کہی کہ جتنی جلدی ہو سکے کانگریس تنظیم کو تلک والوں سے صاف کرنا ان کا سب سے ترجیح والا کام ہے۔ انھیں یہ بھی کہا کہ ایک تلک والے کو اس مسئلہ میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ عبدالرشید میرے ہی کہنے پر محاذ رائے شماری چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہوا تھا۔ دوسرے دن وہ مجھ سے ملا اور یہ سب باتیں اسی نے مجھے سنائیں۔

اسطرح میر قاسم کے دور میں کانگریس فرقہ وارانہ منافرت

کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئی۔ اسی دور میں ریاست کو ملک سے علیحدہ کرنیوالی قوتوں کو بھی حوصلہ افزائی ملی۔ اسی زمانے میں رشوت خوروں کیلئے بھی میدان کھلا چھوڑا گیا۔ افسر شاہی دو دو ہاتھوں سے ریاست اور عوام کی دولت کو لوٹنے لگے۔ جو کہ آج تک اپنے اس مشن میں مصروف ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے، ان میں سے بیشتر افسر قاسم دور کی ہی دین ہیں۔

کشمیر کی مختلف سیاسی تنظیموں نے ہندو مخالف جذبے کی آبیاری 1947ء سے پہلے اور اسکے بعد بھی اپنے سیاسی مفادات کو حاصل کرنے کیلئے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر جاری رکھی تھی۔ 1947ء سے پہلے مہاراجہ کیخلاف لڑائی کو ہندو جارحیت کا رنگ دیا گیا تھا۔ حالانکہ جسطرح کچھ ہندو کو بیٹ کشمیر تحریک کے مخالف تھے اسی طرح مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی اسکی خوب مخالفت کرتا تھا۔ پھر بھی آزادی کی اس فیصلہ کن لڑائی میں اکثر ہندو مسلمانوں کے دوش بدوش کام کرتے رہے۔ 1947ء کے بعد جب نیشنل کانفرنس برسر اقتدار آئی تو انھوں نے مختلف ہندو لیڈروں کو چن چن کے اپنے ظلم کا کسی نہ کسی بہانے سے نشانہ بنایا۔ ان میں سے اکثر سیکولر نظریے اور مذہبی رواداری کے ستون تھے۔ مثال کے طور پر فتح پورہ اننت ناگ کے ایک کسان کانفرنس لیڈر اور نمبردار شیوجی بھٹ کو 1947ء کے بعد کشمیر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس نے نیشنل کانفرنس

کو اٹھارہ سو روپے دیکر جلاوطنی کی سزا منسوخ کرائی۔ یہ وہی شوجی بھٹ تھا، جسکے ہاتھوں فتح پورہ کے مسلمانوں نے حضرت بل فتح پورہ کی مسجدِ شریف کا سنگِ بنیاد ڈلوایا تھا۔ یہ مسجد آج کے دم تک کشمیر کے روایتی ہندو مسلم بھائی چارہ کی مینار کے طور پر کھڑا ہے

مجھے یاد ہے کہ جب ریاست میں صادق صاحب نے پہلے پہل کانگریس کی بنیاد ڈالی تو شیخ صاحب نے کانگریس کو ہندو تنظیم کا فتویٰ دیا اور کانگریسیوں کیساتھ ترکِ موالات کا نعرہ بلند کیا۔ کانگریسیوں کیساتھ ترکِ طعام اور ترکِ کلام تک کیا گیا۔ کانگریسیوں کے خلاف لوگوں میں یہاں تک نفرت پیدا کی گئی کہ ایک دفعہ لوگام کولگام کی ایک مسجد میں ایک کانگریسی کارکن احسن خان نے نماز پڑھی۔ مسجد میں فرش کے بدلے گھاس بچھائی گئی تھی۔ احسن خان کی نماز ادا کرنے کے بعد اس گھاس کو جلا کر پاک کرنے کی بات کہی گئی۔ اور اسکو عملی جامہ پہنایا گیا۔ صحت مند سیاسی نظریے کی جگہ کشمیر کی ہر سیاسی تنظیم نے وقت وقت پر اسی تنگ نظری کا مظاہرہ کیا۔

اس قسم کی تنگ نظری سے کمیونسٹ پارٹیاں (کشمیر کی) مبرا اور پاک نہیں ہیں۔ اس پارٹی کو بھی پہلے سے ہی فرقہ وارانہ بنیادوں پر چلایا گیا جسکی وجہ سے ہی مجھے اس تنظیم سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اس پارٹی میں بھی مخلص اور سیکولر کارکنوں کو حاشیہ پر لا کھڑا کر کے لکڑی سمگلروں اور چرس اگانیوالوں کی ہی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اور یہ سب کچھ رنجور صاحب کی ہی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔

بہرحال قاسم صاحب کے زمانے میں یعنی 1975ء میں شیخ اندرا ایکارڈ ہوا۔ شیخ صاحب چیف منسٹر کی کرسی پر فائز ہوئے انھوں نے رائے شماری محاذ کے زمانے کو آوارہ گردی کا نام دیا، مگر بیس بائیس سال جو عناصر ہندوستان اور ہندوؤں کے خلاف اکسائے گئے تھے اب انھیں کے ہاتھوں میں باگ ڈور تھی۔ شیخ صاحب نے اقلیتی فرقے کے سیاسی لیڈروں کو بھی پوری طرح نظرانداز کیا مثلاً موتی لال بھری جیسے مجاہد آزادی کے برعکس ایک ہندو جج کو اسمبلی میں ہندوؤں کی نمائندگی کرنے کا موقعہ دیا گیا جسکو سیاسی طور پر اقلیتی فرقے کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جموں کے لوگوں کیساتھ بھی ٹھیک ایسا ہی کیا گیا۔

رشوت ستانی اور غنڈہ گردی نے اس زمانے میں نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جسکا ذکر کرنا یہاں ضروری نہیں ہے۔ شیخ صاحب کی وفات کے بعد ان کا صاحبزادہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ریاست کے چیف منسٹر ہوئے۔ اور اسکی لاپرواہی اور ناتجربہ کاری و ناپختگی سے ہی بعد میں غلام محمد شاہ ریاست کی چیف منسٹری کی کرسی پر قابض ہوئے۔ ان کے چیف منسٹر بنانے میں مرکزی حکومت کا بھی رول تھا۔ اس کے ساتھ ہی انکی ہی سرپرستی میں عوامی نیشنل کانفرنس وجود میں آئی۔ جسکی قیادت غلام محمد شاہ کی بیوی اور فاروق عبداللہ کی بہن خالدہ شاہ کر رہی تھی۔ کچھ وقت کے بعد کانگریس پریذیڈنٹ مفتی سعید نے شاہ گورنمنٹ کا تختہ الٹ کیا۔

اپنے وفادار کارکنوں کے ذریعے جنوبی کشمیر کے ہندوؤں کو لوٹ مار کا نشانہ بنوا دیا۔ اس لوٹ مار کا شکار، دُنو، بوگنڈ، وَنپوہ اور دیگر دیہاتوں اور قصبوں کے ہندو ہوئے۔ اس کے علاوہ لوکہ بھون، فتح پورہ، عیش مقام وغیرہ میں کئی دوسرے درجنوں مندر اور ہندوؤں کے مکانات جلا کر راکھ کروائے گئے۔

اس سے پہلے لوگوں میں مذہبی جنون پیدا کرنے کی خاطر ایسی جھوٹی اور بے بنیاد افواہ اڑائی گئی کہ جموں میں مسلموں کا قتل عام ہوا ہے اور وہاں پر مارے گئے کشمیری مسلمانوں کی لاشوں کے بھرے تین ٹرک جلدی ہی کشمیر بھیجی جا رہی ہیں۔ اس افواہ کا مقصد کشمیر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسانا اور بھڑکانا تھا۔ چنانچہ ضلع اننت ناگ میں مسلم فرقہ کے لوگوں نے جلسے جلوسوں میں اپنے غم و غصہ کے مظاہروں کیساتھ ساتھ کئی ہندوؤں کی بستیوں پر حملے کئے۔ مندر جلائے گئے۔ گھر لوٹے لئے گئے۔ اور 1947ء کے بعد پہلی بار منظم طریقے سے ہندو اقلیت کو وادی سے بھگانے کیلئے سازش رچی گئی۔ اس سب کے پیچھے کانگریس میں اقتدار کی بھوک کارفرما تھی۔ نتیجہ ہوا کہ شاہ گورنمنٹ کا خاتمہ ہوا اور فاروق عبداللہ پھر سے چیف منسٹر کی کرسی پر فائز ہوئے اور اقلیتی فرقہ کے لوگوں کے دلوں میں عدم تحفظ کے ڈر اور دہشت کے کالے بادل اور بھی گھنے ہوتے گئے۔ کشمیر میں پہلے سے مذہب اور سیاست خلط ملط کی جا رہی تھی اور 1989ء کے چناؤ میں مذہبی

جنون کا کھیل اپنے عروج پر پہنچا۔ مسلم متحدہ محاذ میں لگ بھگ سارے ہندوستان اور ہندو مخالف گروپ اکٹھے ہوئے جو ہتھکنڈے اس سے پہلے نیشنل کانفرنس اپنا رہی تھی۔ وہی ہتھکنڈے اب حزب مخالف اپنانے لگا۔ پہلے نیشنل کانفرنس اسلام اور پاکستان کے نام پر ووٹ مانگتا تھا۔ اب مسلم متحدہ محاذ بھی اسی طرح نظام مصطفےٰ لاگو کرنے کے لیے لوگوں سے ووٹ مانگنے لگا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایسی سیاست کی بنیاد کشمیر میں خود مرزا افضل بیگ نے ہی ڈالی تھی۔ اس سلسلے میں سبز رومال اور کوہستانی نمک کی ڈلی سے کشمیری عوام بخوبی واقف ہیں جو کہ 1953ء کے بعد بیگ صاحب اپنی ہر تقریر میں لوگوں کو سبز باغ دکھانے کی غرض سے دکھاتا تھا۔ اس طرح وہ ہندو مخالف جذبے کو ابھارتا بھڑکاتا گیا۔ لیکن کانگریس کے ساتھ چناؤ سمجھوتہ کے بعد فاروق عبداللہ اس دورخی پالیسی اور دوعملی چال کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اب اس رول کو مسلم متحدہ محاذ کو نبھانا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے سامنے الیکشن جیتنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہ راستہ تھا "دھاندلی" کا راستہ۔ حکومت نے غیر جمہوری طریقے سے متحدہ محاذ کے کچھ نمائندوں کو اسمبلی کیلئے چنے جانے کا کام ناکام بنا دیا۔ اس طرح سے ہندو مخالف اور ہندو مخالف لاوا بڑھتا اور جوش کھاتا گیا جو کہ بعد میں 1990ء کے آس پاس پوری قوت سے پھوٹ پڑا۔ اس لاوے کو صرف ایک معمولی سی چنگاری کی ضرورت تھی اور وہ چنگاری اور اسکی بدنام آئی۔ ایس۔ آئی ایجنسی نے

فراہم کی۔

کشمیر کی افسر شاہی بھی اس رجحان کو فروغ دینے میں ذمہ دار ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس میں پہلے ہی کچھ عنصر تھے جو کہ ہند مخالف رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے میں سرگرم تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دو کئی معاملوں میں ان عناصر کی ملی بھگت سے ہی کشمیر میں منظم دہشت گردی شروع کرائی گئی۔

1931ء میں جموں و کشمیر تحریک حریت کی ابتداء بدقسمتی سے وچار ناگ اور مہاراج گنج کے ہندوؤں کے لوٹ مار سے ہوئی۔ 90-1989ء میں اسی کو دہرایا گیا۔ لیکن اب کی بار اسکی نوعیت بالکل ہی الگ تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہے 1990ء کے حالات ایک دم اور ایکبارگی سے نمودار ہوئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 1947ء سے ہی وادی کی ہر سیاسی تنظیم اور ہر سیاسی لیڈر نے وقت وقت پر اپنے ذاتی اغراض و سیاسی مفادات کیلئے فرقہ پرستی کو ہوا دی۔ 1947ء سے پہلے شیخ عبداللہ کے سیکولر نظریات نے امید کی کرن جگائی تھی لیکن آزادی کے بعد آپنے اقتدار کے دوران ہر بار انھوں نے بھی کسی نہ کسی طرح وہی حربے اور ہتھکنڈے اپنائے جو 47ء سے پہلے مسلم کانفرنس اپنا رہی تھی۔ وہ شاید ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ ایسا کرنے سے وہ جموں و کشمیر میں اپنی بادشاہت کو دیرپا طریقے پر قائم رکھ سکتا ہے۔ جمہوری اقتدار کیلئے لڑتے لڑتے وہ بھی بالآخر غیر جمہوری طرز عمل و غیر جمہوری رجحان پر اتر آئے۔ ان کے پرانے ساتھی کشپ بندھو

نے یہ باتیں بارہا ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں بھی اُٹھائی تھیں۔ اور کئی بار اُس نے اُنھیں سیاست اور مذہب کو خلط ملط نہ کرنے کی صلاح دی تھی چنانچہ ایک بار اُس نے شیخ عبداللہ کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اوقاف کی نگرانی حکومت کی دخل اندازی کے بغیر کسی مذہبی تنظیم کے سپرد کی جائے کیونکہ حکومت کی نگرانی ہونے سے سیکولرازم کا دھاوا کرنے والی برسر اقتدار تنظیم کی دلچسپی اپنے معاملوں سے ہٹ کر مذہبی معاملوں میں ہی اُلجھتی رہتی ہے۔ شیخ عبداللہ نے یہ تجویز رد کر دی۔ اس پر کشپ بندھو بھی نیشنل کانفرنس سے کنارہ کش ہوئے۔ شیخ عبداللہ نے اپنی ایک تقریر میں یہ بھی کہا تھا۔ "کہ اسلام سورج ہے اور باقی مذہب ستارے۔ سورج کے نکلنے کے بعد تارے غائب ہو جاتے ہیں۔" یہ اُس لیڈر کے سوچ کی ایک حیران کن تبدیلی تھی جو کبھی وادیٔ کشمیر کے سیکولرازم کے علمبردار اور میر کارواں رہے تھے۔ یہی وہ شیر کشمیر تھے جس نے ہندو مسلم سکھ اتحاد کا نعرہ بلند کیا تھا۔ دراصل وہ اُن دنوں لوگوں میں اپنا اعتماد اور اعتقاد قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے جس وقت جو بات اُس کے اس مقصد میں ممد و معاون دکھائی دیتی تھی، وہی کرتا تھا۔ لیکن یہی اُس کی بڑی بھول تھی اور آج کل ہم سبھی ہندو مسلمان کشمیری اُسی بھول کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ شیخ عبداللہ نے ہزاروں سالوں سے کشمیر میں رہ رہے کشمیری ہندوؤں کو کشمیر کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں کبھی اہمیت نہیں دی۔ وہ اکثر اس فرقے کو "ذمی" نام سے منسوب کرتا تھا اور اُنکو

اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا متقاضی تھا۔ جس سیکولرازم کی بنیاد ایسے سوئچ پر ٹکی ہوئی ہو وہاں پر کونسی مذہبی رواداری کی بات کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ صاحب کے زمانے سے ہی کشمیر میں فرقہ پرست قوتوں کو پنپنے کا موقعہ ملا جس کا پہلا لاوا 1986ء میں پھوٹ نکلا۔

---

(تحریک کے دوران کلچرل سرگرمی کے سلسلے میں یہ بات درج کرنا بھول گیا تھا)

[ ہمیں جالندھر، بمبئی اور کلکتہ میں امن کانفرنس کے سلسلے میں جانے کا موقعہ ملا۔ جالندھر اور بمبئی میں سوماتھ الپورب، بھی ٹروپ کیساتھ شامل تھا۔ کلکتہ کے کلچرل ٹروپ میں دینا ناتھ نادم۔ عبدالغنی نمتہ ہالی، سوماتھ کلم، سوماتھ بالی اور رشی دیو بھی ساتھ تھے۔ اُن دنوں ایٹم بم پر پابندی لگوانا عالم امن کیلئے ایک اہم مسئلہ تھا۔ ہم نے کشمیر سے ایک بڑا جار (پیر ہاشی) تحفہ کے طور لیا تھا۔ اس جار پر عبدالاحد آزاد، رسول میر، اور نادم کے اشعار بھی اُس پر لکھوائے تھے۔ ]

# سنہ ۱۹۹۵ء

# اُمیدوں کی موت

شیخ محمد عبداللہ کے بعد جو بھی رہنما کشمیر کی سیاست پر چھا گئے وہ بھی اپنی طرف سے کشمیری ہندوؤں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر کترنے میں پیہم لگے رہے۔

1975ء میں جب شیخ عبداللہ دوبارہ برسر اقتدار آیا تو اپنے منسٹر ڈی۔ ڈی ٹھاکر کو اس بات کی ہدایت دی تھی کہ منسٹر چاہے کسی بھی آدمی کی تقرری کرے وہ مجاز ہے لیکن کشمیری ہندو کو کسی بھی نوکری سے دور رکھا جائے۔ کشمیری ہندو کیلئے اس نفرت کی ایک وجہ تھی کہ کشمیری ہندو امن پسند اور قوم پرست تھا۔ اس کے بعد کی حکومتوں نے رفتہ رفتہ کشمیری ہندوؤں کی جڑیں کاٹنے کی پالیسی برقرار رکھی۔ 1989ء تک یہ پالیسی نقطۂ عروج تک پہنچی تھی۔ 1990ء میں جب دہشت گردی نے وادی میں سر اٹھایا تو پہلا نشانہ ہندو اقلیت کو ہی بنایا گیا جس کی پاداش میں وادی بھر میں ہندوؤں کا صفایا کر کے اسکو ISLAMISATION کیطرف لینے میں ہر سطح پر کوشش کی گئی۔ پہلے مرحلے میں ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر وادی سے بھگانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کی قتل و غارت اور لوٹ مار شروع ہوئی۔ ٹیکا لال ٹپلو، نیل کنٹھ گنجو، پریم ناتھ بھٹ وغیرہ ذی شعور اور قوم پرست ہندو شہریوں کو دن

ہاڑے قتل کیا گیا۔ آہستہ آہستہ پوری وادی میں ہندوؤں کے قتل و غارت کا ننگا ناچ برپا ہوا۔ لوگوں کو اذیتیں دے دیکر بہت ہی بے دردی سے مارا گیا۔ یہاں تک ہندو عورتوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ایک ہندو عورت کے بدن کو لکڑی چیرنے کے آرے سے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ ایسا لگنے لگا جیسے کہ وادی کشمیر سے انسانیت یکایک غائب ہو گئی اور اس وادی گلپوش کو درندوں اور وحشی مخلوق نے آگھیرا ہے۔ مذہب کے علمبرداروں نے مذہب کے نام پر وہ کارہائے بد سرانجام دیئے کہ سن کر ہی انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ کشمیری ادبی دنیا کے ایک شریف النفس شاعر اور تجربہ کار استاد سروانند کول "پریمی" کو ان کے بیٹے کے سمیت گھر سے اغوا کر کے اسکی پیشانی پر کیل ٹھونک کر قتل کیا گیا۔ اس کا قصور صرف اتنا ہی تھا کہ اس نے زندگی بھر کشمیریت اور کشمیری زبان کو اپنے سینے سے لگایا تھا۔ بھوشن لال آمنہ۔ اویل کو لگام کے اوتار کرشن رینہ، بجبہاڑہ کے پوشکر ناتھ، شرت کے رادھا کرشن، اشمو جی کے رادھا کرشن، بھانہ گنڈ کے موتی لال کچھ ایسے نام ہیں جو اس وقت میری زبان پر آتے ہیں، جن کو دہشت گردوں نے اپنی درندگی اور وحشی پن کا نشانہ بنایا نفرت اور ظلم کی یہ انتہا تھی کہ ان کی لاشوں کو اٹھانے اور انتم سنسکار (آخری رسومات) انجام دینے کی پاداش میں بھی کچھ لوگوں کو قتل کیا گیا۔ جسکا عیاں ثبوت ٹیکا لال ٹپلو کو قتل کرنے

کے بعد اُسکی ارتھی کے ساتھ چلنے والے متحرک اور جوشیلے کشمیری پنڈت نوجوانوں کو چُن چُن کر گولی کا نشانہ بنانا ہے۔

کشمیر جو صدیوں سے علم و ادب اور روحانیت کا گہوارہ رہا ہے، یکبار دورِ جہالت کی گرفت میں آگیا۔ جس کشمیر نے ابھنو گپت، بھٹ کلٹ، کھیمندر، لل دید، شیخ العالم، غوث العظم دستگیر، پرمانند اور غنی کشمیری جیسے عظیم سپوت پیدا کیے ہیں۔ اُسی کشمیر میں بیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور میں مذہب کے نام پر ایک چھوٹے سے فرقے کیساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا۔ جسکی مثال تاریخ میں مشکل سے ہی ملتی ہے۔ بہتوں اور بے قصوروں کے قتل و غارت کو جہاد کا نام دیا گیا۔ سچ مچ یہ جہالت اور مذہبی جنون کشمیری روایات اور زندگی کی قدروں کے مطلق برعکس تھیں۔ کیا اس کیلئے پاکستان ہی پوری طرح ذمہ دار ہے؟ میرے خیال میں یہ سو فیصد صحیح نہیں ہے۔ ان حالات کیلئے ہمارے سیاسی رہنما، مرکزی حکومت دونوں قصوروار ہیں۔ پاکستان نے صرف جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ لیکن ایسا ماحول خود کشمیری رہنماؤں اور مرکز کی لاتعلقی سے ہی وجود میں آیا۔ ہندوستان کے ان دنوں کے انٹر سکیورٹی کے وزیر جارج فرنانڈیز تک نے ان دنوں سرینگر میں آکر یہ کہا کہ کشمیری مسلمان اس لئے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گیا کیونکہ کشمیر میں زندگی کے ہر شعبہ میں ہندو حاوی ہے۔ اس بات کی تائید تو لین سنگھ، ایس جھا، برج برڈواج

آئینا گگل وغیرہ قومی سطح کے صحافیوں نے جھلکی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سارے معاملے کا ایک فیصد تک سچائی نہ جاننے والے ان صحافیوں کو لوگوں کا درد بالکل محسوس نہ ہوا۔ اُن کو بھی ہندو جو پہلے ہی دُکھی تھے، سب دُکھوں کی جڑ نظر آنے لگے۔ کشمیری قوم پر ہو رہے اس ظلم و ستم کے خلاف کسی نام نہاد انسانی حقوق کے چمپئن یا ادارے نے اُف تک نہیں کی بلکہ سبھوں نے اس ہندو کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔

کشمیر میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے والی بدیشی طاقتوں کے اداروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ 1846ء سے لیکر آج کے دم تک سامراجی طاقتیں اپنے جنگی اور دوسرے ذاتی مفادوں کی خاطر اس کو نشانہ بناتے رہے۔ جموں کشمیر کی باگ ڈور مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ میں آنے کے وقت سے ہی تب کی برٹش گورنر نے اس ریاست میں اپنے مضمر مفادوں کا اظہار کیا ہے۔ آگے چل کر برٹش سرکار نے یہاں اپنے ریذیڈنٹ مقرر کر کے اُسے اعلیٰ اختیارات دیئے۔ اُسکے بعد برٹش ٹریڈ ایجنسی قائم ہوئی، جسکا ظاہری مقصد وسط ایشیا کے ساتھ تجارت کی نگرانی تھا۔ لیکن پس پردہ یہ ایجنسی وسط ایشیا کی دوسری بڑی طاقتوں مثلاً روس و چین کے بڑھتے اثر و رسوخ کو کند اور کم کرنے پر مامور کی گئی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد ہی انگریز سرکار کشمیر میں تمام فرقہ پرست اور استحصالی طاقتوں کی پشت پناہی کرتا رہا۔ 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے بعد کشمیر پر پاکستان

کا حملہ ہوا۔ اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف سے ہی یہ معاملہ یو۔این۔او میں پیش کیا گیا۔ لیکن سامراجی طاقتوں نے وہاں بھی پاکستان کی ایک حملہ آور کی حیثیت سے نکتہ چینی کرنے کے بجائے ایسا کھیل کھیلا جس سے آئندہ کیلئے ان سامراجی طاقتوں کو کشمیر معاملوں میں اپنی مداخلت آسان ہو جاتی اور وہ اپنے جنگی مقاصد اور اسلحہ کی فروخت کیلئے یہاں مذہب اور ذات کے نام پر لوگوں کو اُکسا کر ہندوستان کی سالمیت کیلئے خطرہ پیدا کر سکیں۔ یہ کوششیں کبھی ڈکسن پلان اور کبھی ایڈمیرل نمٹر کے ایڈمنسٹر قائم کرانے کی صورت میں بھی سامنے آئیں۔ کبھی یو۔این۔او کی امن فوجوں کے زیر نگرانی رائے شماری کرانے کی تجویز رکھ کر ہندوستان کے سیکولر تصویر کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندوستان کی جمہوریت کی حمایت سے سامراجی طاقتوں کی یہ سازشیں ناکام بنا دی گئیں۔ 1947ء کے بعد پاکستان نے 1965ء میں کشمیر پر حملہ بول دیا۔ لیکن اُسے پہلے ہی کی طرح منہ کی کھانی پڑی۔ 1971ء میں اُس نے پھر تیسری جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ کو بھی ہندوستانی عوام اور کشمیر کی جمہوری تحریک نے ڈٹ کر مقابلہ کر کے پسپا کر دیا۔ اور پاکستان کو نیچا دکھا دیا۔ لیکن پاکستان نے پھر اپنے ناپاک عزائم اور ارادوں کی عمل آوری کیلئے دہشت گردی کا دوسرا حربہ اپنایا۔ کشمیر کی سیاست پہلے ہی اُن آدرشوں اور اصولوں کے حصول

کے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ جو کہ نیا کشمیر کے پروگرام کی حقیقی روح تھی۔ اور اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا تھا اُس کو سُلگانے کا آسان موقعہ پاکستان کو آخر کار تب ملا جب 1990ء کے آس پاس اُس نے ہمارے نوجوانوں کو اپنی زمین پر ہتھیار چلانے اور تخریبی کاروائیاں کرنے کی تربیت دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ چونکہ آمنے سامنے کی کھلی جنگ میں وہ تین بار بُری طرح سے شکست کھا چکا تھا۔ اور آگے بھی اُسے اسی جنگ میں کامیاب اور فتح یاب ہونا ناممکن ہی لگ رہا تھا۔ اس لئے اُس نے دہشت گردی کے ذریعہ درپردہ جنگ شروع کردی۔

لیکن باریکی اور گہرائی سے دیکھا جائے اس سب کیلئے تو ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ کشمیر کے سیاست دانوں نے جان بوجھکر سیاسی کارکنوں اور عوام کو جمہوریت اور ترقی کے سائینسی نظریہ سے ناواقف اور بے خبر رکھا۔ انکو اگر کچھ سمجھایا گیا تھا وہ صرف شخص پرستی اور ذاتی وفاداری کے گھٹیا ترین بے تھے۔ سیکولر سیاسی اصولوں کے برعکس کشمیری رہنماؤں نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اپنی کرسی کے تحفظ کے بارے میں ہمیشہ سوچا۔ شخصی وفاداری کی حد مرزا افضل بیگ کی سیاسی زندگی کے انجام سے بھی سامنے آتی ہے۔ جس نے زندگی بھر شیخ عبداللہ کے کھرے کھوٹے کا ساتھ دیا اور تحریک حریت کے دنوں سے ہی قدم بہ قدم اُسکے ساتھ رہا۔ لیکن کنبہ پروری کے راستے میں جب اُسے رکاوٹ سمجھا گیا تو بڑی بے دردی کیساتھ اُسے بھی

بخشا نہ گیا بلکہ اُسے بھی پارٹی سے نکالا گیا۔ بعد میں جب وہ عوام کے سامنے اپنی کارکردگی اور اپنے ساتھ ہوئے برتاو کو تفصیلی طور پر حضوری باغ سرینگر کے ایک جلسے میں رکھنا چاہتے تھے تو نیشنل کانفرنس کے غنڈوں نے وہاں بھی افراتفری مچائی اور اس جلسے کو ناکام بنا دیا۔ پنڈال پر پتھر برسائے گئے۔ خوش قسمتی سے شامیانہ گر پڑا اور افضل بیگ اس کے نیچے سے چھپتے چھپاتے بھاگ نکلا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب افضل بیگ کے جیسے قد کے رہنما کی ایسی درگت اور بے عزتی کی جائے تو ذمی کہلانے والا عام ہندو کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ 1990ء میں جو کچھ ہندوؤں کے ساتھ ہوا وہ ایک لمبے عرصے کی سیاسی تنگ نظری کا ہی نتیجہ مانا جا سکتا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کا وجود میں آنا کن سیاسی رہنماؤں کی کارسازی کا نتیجہ ہے۔ جماعتِ اسلامی کی حوصلہ افزائی کس نے کی۔ کشمیری عوام کے ذہنوں میں سیاسی غیر یقینی کا جذبہ کس نے پیدا کیا۔ یہ سبھی اندر کے دشمن تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو سیکولرازم کی مالا جپتے ہوئے بغل میں چھری رکھتے تھے۔

دوسری بات یہ بھی ہے اہم ہے کہ 1947ء سے آج تک ہر کسی حکمران نے صرف دولت کمانے کا مقصد ہر دلعزیز رکھا۔ صرف اسی ایک جذبے کو اولین ترجیح دی۔ کسی نے بھی سنجیدگی سے کشمیری عوام یا جموں و کشمیر کی عوام کو انِ سازشی عناصر کے برے اور

ناپاک ارادوں سے باخبر کرنے کی اور ان کا مقابلہ کرنے کی دلچسپی نہیں دکھائی بلکہ ہر کوئی اپنی اپنی طرح سے نفرت کے ماحول کو جو وقت وقت پر سر اٹھاتا دکھائی دیتا تھا، آبیاری کرتا گیا۔ اور جب 1990ء میں حالات قابو سے باہر ہو گئے تو سب رہنما تماشہ بینوں کی مانند اپنے کرموں کا پھل دیکھ رہے تھے لیکن 1990ء میں جو کچھ ہوا۔ اس سے ان کا کچھ بھی نہیں بگڑ گیا۔ وہ لوگ تو اب بھی عیش و آرام کی زندگی جیتے ہیں۔ اس سب کا شکار بیشتر طور پر کشمیری ہندو اور قوم پرست مسلمان ہی ہوا۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ حزب المجاہدین الشد ٹائگرس، ایریشن بالاکوٹ سب دہشت گرد تنظیموں کا یہی ایک ترجیحی پروگرام تھا کہ کسطرح سے کشمیری ہندوؤں اور قوم پرست مسلمانوں کو اپنی جڑوں سے اکھاڑ کر بے وطن کیا جائے اور پناہ گزینوں کی زندگی جینے پر مجبور کیا جائے۔ 1990ء کے سرمائی کشمیر کی فضا ان نعروں سے گونج رہی تھی۔

اسہ چھ بناؤن پاکستان
بٹو روس بٹنیو سان

یعنی ہمیں یہاں پاکستان بنانا ہے۔ ہندو مردوں کے بغیر لیکن ہندو عورتوں کے سمیت۔" یہ نعرہ ان لوگوں کے برے ارادوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ اخلاقی طور پر وہ کتنے گرے ہوئے اور گئے گزرے لوگ تھے۔ کشمیری ہندوؤں پر ظلم و تشدد کی کہانی اگ بھگ چھ سو سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ جب سلطان سکندر بت شکن

کے زمانے میں انھیں اپنی جانیں بچانے کیلئے تین آپشن option رکھے گئے تھے یہ ہیں "ژلن، ژلن یا گلن" جنکا مطلب بھاگنا، مذہب تبدیل کرنا یا مرنے کیلئے تیار رہنا۔ تب سے لیکر 1990ء تک بارہا کشمیری ہندوؤں کو ان تین متذکرہ بالا راستوں میں سے ایک راستہ چننے پر مجبور کیا گیا۔ 1990ء میں بھی پھر ایکبار کشمیری ہندوؤں کو بھاگنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس جبر و ظلم کے سامنے انکی پیش نہ چلی۔ جان کے لالے انسان کو کیا کچھ نہیں کراتے۔

شاید 13 اپریل 1990ء کے اخبار "الصفا" میں ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں کشمیری ہندوؤں کو وارننگ دی گئی تھی کہ اگر وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وادی چھوڑ کر نہیں جائیں گے تو ان کا قتل عام کیا جائیگا۔ ایک طرف سے ہندوؤں کو کشمیر چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا تھا تو دوسری طرف یہ پروپیگنڈا بھی بڑے زور و شور سے کیا گیا کہ کشمیری ہندو اس وقت کے گورنر شری جگموہن کے کہنے پر وادی چھوڑ رہے ہیں۔ جو کہ بالکل من گھڑت اور سفید جھوٹ تھا۔ وہ لوگ جو ایسا کہتے ہیں، ملک اور قوم کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ یہ بھول رہے کہ وادی بھر کی مساجد میں لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے کشمیری ہندوؤں کو طرح طرح کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ وہ لوگ ان نعروں کے مفہوم سے بھی بے بہرہ بننے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ جیسے یہ نعرہ ——

"چھو کی کشمیر میں رہنا ہے اللہ اکبر کہنا ہے"

(یا) اے ظالمو اے کافرو کشمیر ہمارا چھوڑ دو

اسی طرح یہ نعرے —

کشمیر میں کیا چلیگا۔ نظامِ مصطفےٰ

ہمیں کیا چاہیئے نظامِ مصطفےٰ

(یا) یہ نعرے —

جاگو جاگو صبح ہوئی جاگو جاگو صبح ہوئی

چین نے بازی ہاری ہے اب کشمیر کی باری ہے

پیپلز لیگ کے ایک اشتہار کی عبارت ملاحظہ ہو اور پھر سوچیئے کہ کشمیری ہندو کو وادی سے کس نے بھگایا؟ —

پیپلز لیگ کا کیا پیغام فتح، آزادی اور اسلام

اور اسی طرح یہ دوسرا اشتہار —

اسلام ہمارا مقصد ہے قرآن ہمارا دستور ہے

جہاد ہمارا راستہ ہے

الٹا ٹائیگرس کا یہ اشتہار بھی اس ضمن اہم ہے —

اللہ اکبر۔ مسلمانو جاگو کافرو بھاگو، جہاد آرہا ہے

ایسے نعروں اور ایسے اغراض و مقاصد کی حصولیابی کے لئے جو جدوجہد شروع ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کے دوران ہندوؤں کا کیا حشر کیا جاتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے پہلے بھی اگر پاکستان ایک کرکیٹ میچ ہار جاتا تھا تو شر پسند عناصر کے غصے کی بجلی ہندوؤں پر پڑتی تھی۔ اُن کے مکانوں پر پتھراؤ کیا

جاتا تھا۔ اگر پاکستان کی جیت ہوتی تو بھی کشمیری ہندوؤں پر طعنے کسے جاتے تھے۔ گالیاں دی جاتی تھیں۔

ان کیلئے ہزاروں سالوں سے کشمیر میں رہنے والا ہندو کشمیری نہیں تھا بلکہ شیخ عبداللہ کے زمانے سے ہی اُسے انڈین ایجنٹ تصور کیا گیا تھا۔ اب اس صورتِ حال میں ہندوؤں کیلئے کشمیر میں رہنا کیسے ممکن تھا۔ جبکہ اُسے صاف الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے نظام میں آپ کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ اُس سے پہلے ہی دوسرے درجہ کے شہری کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسطرح ۱۹۹۰ء میں اُسے اپنے گھر بار، زمین و زراعت و باغات کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔

سوچنے والی بات ہے کہ کیا کوئی کمیونٹی ہنسی خوشی اور جان بوجھ کر اپنے مال و جائداد کو چھوڑ کر غریب الوطنی اور شرنارتھیوں کی زندگی تسلیم کرے گا۔ شاید ایک دو بیوقوف آدمی ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن پوری قوم کیلئے ایسا کٹر فیصلہ کرنا ناممکن بھی ہے اور غیر فطری بھی۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کشمیری ہندو قوم اگر بڑے سرمایہ داروں پر مشتمل نہیں تھا لیکن مفلس بھی نہیں تھی۔ اس فرقے کا ہر فرد پڑھا لکھا تھا اور سبھی لوگ عزت سے اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے اہل تھے۔ ایسی قوم کیلئے یکبار سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ بھاگ جانا یہ بات سامنے لاتی ہے کہ اُن پر کس طرح کے مظالم ڈھائے گئے ہیں۔

کچھ لوگوں کو ایسی بے دردی سے مارا گیا کہ اس کا ذکر کرنے سے ہی رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال تحصیل شوبیاں کے ہارمین گاؤں کے برجنا تھ کول کی ہے۔ کول، اُسکی بیوی اور اُسکی بہن کو مئی ۱۹۹۰ء میں اغوا کیا گیا۔ دونوں جواں عورتوں کے ساتھ سرِعام ناشائستہ سلوک کیا گیا۔ اُن کے کپڑے پھاڑے گئے اور اُن کے ساتھ بے حد بدسلوکی کی گئی۔ اس کے بعد دونوں کی عصمت دری کی گئی۔ اس عذاب کے بعد امام صاحب گاؤں میں میاں بیوی کو ایک رسّی کے ذریعے ایک جیپ کیساتھ باندھا گیا۔ جیپ کو پتھریلی سڑکوں پر دن دھاڑے تیز رفتاری سے چلایا گیا۔ میاں بیوی کچھ دیر کیلئے چیختے بلکتے رہے۔ اُنھوں نے مدد کیلئے پکارا۔ لیکن اُن کی مدد کیلئے کوئی سامنے نہ آیا۔ اس کے برعکس آس پاس کے لوگ تک اُنکی طرف نفرت کی نگاہیں ڈالتے رہے۔ اُن کو تب تک جیپ کے ساتھ باندھکر گھسیٹا گیا جب تک کہ اُنھوں نے چیختے چیختے آخری سانس نہ لی۔ ایسے ہی کئی انسانیت سوز واقعات کی داستان ہے جن کا بیان کرتے کرتے کئی صفحات درکار ہیں۔

آمنہ کے بھوشن لال کی المیہ بھی دردناک ہے۔ وہ اپنی تنخواہ لینے کیلئے ڈکسم چلا گیا لیکن دہشت گردوں نے پہلے ہی اُس کیلئے جال بچھا دیا تھا۔ اُسے ڈکسم جاتے ہوئے پکڑا گیا اور کسی نا معلوم جگہ پر لیجا کر اُسے طرح طرح کی اذیتیں دیکر اُس کا بُرا حال کر دیا۔ اُسکے کان کاٹے گئے، زبان اُدھیڑی گئی۔ اُسکی آنکھیں کُرید کر باہر

نکال کر رکھدی گئیں اور آخر کار اُسے مارا گیا۔

اِس کے ساتھ ساتھ وطن پرست مسلمانوں کو بھی چن چن کر مارنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ میر مصطفےٰ، غلام نبی گلکر، عبدالستار رنجور، مولانا مسعودی اور مولوی فاروق جیسے رہنماؤں کا سفاکانہ قتل کیا گیا۔ اس طرح سے وادی بھر میں ہر طرف خوف و دہشت کا ماحول برپا کیا گیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب مذہبی اپیل کشمیر کے لوگوں کو متاثر نہیں کرتی تھی۔ جسے 1938ء سے لیکر 1953ء تک کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب مذہبی اپیل کے بجائے لوگوں کو نیا کشمیر پروگرام ہی سب کچھ لگتا تھا۔ لوگوں کو شیخ محمد عبداللہ پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ چونکہ اس سلسلے میں کشمیر کی گلی گلی اور گاؤں گاؤں میں اکثر یہ نعرہ گونج اُٹھتا تھا۔ ہر کشمیری کی زبان پر یہ نعرہ تھا ؎

الہ کرے گا وانگن کرے گا　　شیر کرے گا شیر کرے گا

لیکن 1951-52ء کے بعد ہی کشمیر کے سیاسی لیڈروں نے ہند مخالف پالیسی اپنا نصب العین بنایا۔ رائے شماری محاذ کے بننے کے بعد ہی ہند مخالف پلیٹ فارم باضابطہ طور وجود میں آیا۔ جس کی حوصلہ افزائی بخشی نیشنل کانفرنس کے لوگ بھی عوام پر اپنی گرفت رکھنے کیلئے کرتے رہے۔ اس سے یہ لاوہ آہستہ آہستہ جمع ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ اندر ہی اندر جوش کھانے لگا۔ شیخ عبداللہ بھی اگرچہ سیکولرازم کا مکھوٹا پہنے ہوئے تھا لیکن وہ بھی الیکشن

کمیونل بنیادوں پر ہی لڑتا رہا۔ اس طرح جس زہر کی آبیاری اس نے کی وہ زہر آج انکی تنظیم کو بھی متاثر کرنے لگا۔ اس تنظیم کے متعدد لیڈر اور کارکن مارے گئے۔ یہ دراصل عمل اور سوچ کے فرق کا نتیجہ ہے۔ جس آدمی کا دل کچھ اور زبان کچھ ہو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔

جسطرح بھٹو نے ایک طرف جمہوریت کو فروغ دیا لیکن دوسری طرف احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا اور جمہوریت کی جڑیں کریدنے کا عمل شروع کیا۔ نتیجہ وہی کہ وہ خود ہی اسکا شکار بھی ہوا۔

یا جسطرح اندرا گاندھی کو سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر بھنڈراوالے جیسے غنڈوں کو کھڑا کر کے خود ہی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بالکل اسی طرح کشمیر میں بھی نیشنل کانفرنس یہ خمیازہ بھگت رہی ہے۔ نہ صرف نیشنل کانفرنس بلکہ باقی سیاسی تنظیمیں بھی اس آگ کو ہوا دیتے رہے۔ چاہے وہ کانگریس ہو یا اور کوئی پارٹی۔

جب وادی میں ایسے حالات رونما ہوئے۔ میں ایک دن میر قاسم سے ملنے سرینگر گیا۔ میں نے اسے اس بارے میں پوچھا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس کا جواب تھا کہ "میں اس وقت ہر کسی سیاسی بات سے لاتعلق ہوں"۔ میں صرف نمازیں ادا کرتا ہوں"۔ اسے تو لاتعلق رہنا ہی تھا۔ کیونکہ وہ بھی اس لاوے کو پکنے کیلئے اپنا پورا پورا رول تو ادا کر چکا تھا۔

شیخ عبداللہ نے اپنے زمانے میں ہی فاروق عبداللہ کو اپنے جانشین کے طور پر سامنے لایا۔ اُنکے مرنے کے بعد فاروق عبداللہ نے حکومت سنبھالی۔ اُنکی سیاسی سوجھ بوجھ اور تجربہ کی کمی کو بھانپتے ہوئے افسر شاہی من مانے ڈھنگ سے کام چلاتے رہے۔ کشمیر کی سیاست کی ازلی خامیاں دور کرنے کی بات تو دور، اس کے دور میں سیاسی ڈھانچہ اور بھی ابتر ہو گیا۔ اس کے بعد غلام محمد شاہ کی حکومت نیشنل کانفرنس کے کچھ ممبران اسمبلی اور کانگریس کے اسمبلی ممبروں کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے قائم ہوئی۔ اس قسم کا عمل بھی مرکزی حوصلہ افزائی کی ہی بنیاد پر وجود میں آگیا۔ 1986ء میں وہ لاوا پہلی بار بڑے پیمانے پر پھوٹ گیا، جو کشمیر کے سیاسی لیڈر دھیرے دھیرے اکٹھا کر رہے تھے۔ ان دنگوں میں کانگریس کے کارکنوں نے بڑھ چڑھکر حصہ لیا۔ ان دنگوں میں دُنو، بوگنڈر، ونیوہ اور کولگام وغیرہ میں ہندوؤں کے مکانات جلانے اور درجنوں مندروں کو مسمار کرنے کے پیچھے اس زمانے کے کانگریس صدر مفتی محمد سعید کے دو ذاتی مقاصد کارفرما تھے۔ اول تو لا اینڈ آرڈر مشینری کو فیل کر کے غلام محمد شاہ کی کرسی کو چھین لینا۔ دوم اس ہندو مخالف جذبے کی بھڑاس نکالنا جو ابتداء سے ہی اُس کے دل میں موجود تھی اور موقعے کی تلاش میں تھی۔ اور یہی ہے وہ کارکردگی جو مفتی صاحب کے لئے ایک سند بن گئی۔ اسی کے لئے وی۔ پی۔ سنگھ کی حکومت میں وہ امام بخاری کی سفارش پر اس

بدقسمت قوم کے ہوم منسٹر بنائے گئے۔ 1986ء کا واقعہ پٹھان راج کے ظلم و ستم کے تاریخی دور کے بعد پہلا بڑا واقعہ تھا اور اس کے کھلنایک مفتی سعید ہی مانیں جائیں گے۔

1986ء سے ہی کشمیری ہندو اپنے آپکو اپنے آبائی وطن کشمیر میں غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تھے بلکہ اُسی زمانے میں بہت سے لوگوں نے جموں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں، دوسری جگہوں پر بھاگنے کا من بنایا تھا۔ اسی زمانے میں کشمیری ہندو پہلی بار شدت سے محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے ہی گھر میں پرائے کی طرح رہ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر ضروری اور غیر اہم سمجھنے لگا جیسے کہ یہاں کوئی وقعت ہی نہیں ہے اسکی۔ کشمیر کی فرقہ پرست سیاست نے اُسکو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ کشمیر ایک خاص ٹولے کی جاگیر ہے اور ہندوؤں کیلئے بانہال کا راستہ ہر دم اور ہر وقت کھلا ہے۔ ہندو کیلئے پہلے سے ہی نوکری حاصل کرنا اور عزت سے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بن گیا تھا۔ فرقہ پرست سیاستدانوں نے پہلے سے ہی دو قومی نظریہ کے تحت اور سیکولر ازم کے نام پر بھی ہندو مخالف ایجنڈا قائم کیا تھا۔ اور طرح طرح کی دشواریوں سے اس کو مفلوج بنا کر رکھا تھا۔

جب میں کانگریس کا تحصیل پریذیڈنٹ تھا تو میر قاسم صاحب نے پہلے ہی مجھ سے یہ کہکر رکھا تھا کہ سرکاری نوکریوں کیلئے جو بھی لسٹیں تنظیم کی طرف سے تیار کی جائیں گی۔ اُن میں اُس

نے اُن لوگوں کے نام بھی کسی ایک فہرست میں شامل کرنا نہیں مانا جنھوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس میں کئی سال متواتر اور بلا معاوضہ کام کیا تھا۔ ایکبار اُنھوں نے مجھے صاف صاف کہا کہ ہندو اُمیدواروں کیلئے سارا ہندوستان کھلا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہندو نوجوان بے روزگاری اور بیکاری کی وجہ سے ذہنی انتشار میں مبتلا ہوا۔ ایک طرف تو وہ خود ہی اقتصادی بدحالی کا شکار تھا اور دوسری طرف کشمیر کے تنگ نظر سیاستدان اُس کا تماشہ تڑپنا دیکھ رہے تھے۔ اس کے خلاف نئی نئی سازشیں ہونے لگیں۔ اس عمل کو جاری رکھنے کیلئے اور اس کو تیز تر کرنے کے لئے بھی ریاست کی ہر سیاسی پارٹی یعنی کانگریس، نیشنل کانفرنس و جماعت اسلامی نے کسی نہ کسی طرح کشمیری ہندو کو اپنا نشانہ بنایا۔

اب یہ اقلیتی فرقہ جموں، دہلی، اودھمپور وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں کسمپرسی اور مصیبت کے دن گزار رہے ہیں۔ ان مظلوموں کو کچھ قلیل مالی امداد تو دی جاتی ہے لیکن بے شمار لوگ بے وسیلہ ہیں اُن کی کوئی سنتا نہیں۔ اور جن کو یہ تھوڑی امداد دی جاتی ہے وہ تو کسی حد تک فاقہ کشی سے بچ گئے لیکن پھر بھی یہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کیلئے گوناگوں مصیبتیں جھیل رہے ہیں کئی مائیگرنٹ کیمپوں میں پریشان ہیں اور دوسرے

ایک مکان سے نکالے جانے پر دوسرے کرایہ مکان ڈھونڈنے کی پریشانیوں سے جھوجھتے ہوئے کسی طرح جی جان کا رشتہ قایم رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح ایک سیکولر اور جمہوری دیش کے شہری اپنے ہی گھر میں بے گھر اور بے در ہیں۔

۱۹۹۰ء میں جب وادیٔ کشمیر پر یہ مصیبت کے بادل چھا چکے تھے۔ میں اپنے کسی کام کیلئے جنوری کے پہلے ہفتے میں جموں آیا تھا۔ اُن دِنوں افواہوں کا بازار گرم تھا۔ جتنے منہ اُتنی باتیں ہو رہی تھیں۔ کبھی یہ افواہ اُڑائی جا رہی تھی کہ ہندوؤں کو جگموہن نے کشمیر چھوڑنے کیلئے کہا تھا تاکہ وہ وادی میں مسلمانوں پر جبر و ظلم کی پالیسی اور زور و زبردستی کی حکمت عملی روا رکھ کے ملیٹنسی پر قابو پا لیگا۔ کبھی یہ افواہ اُڑائی گئی کہ ہندو لوگ جموں جا کر ٹریننگ کرتے ہیں۔ ہتھیار چلانا سیکھنے کی۔ ایسی ایسی عجیب افواہیں اُڑائی جاتی تھیں۔ حالانکہ جب میں بھی جموں آیا تو میرے بارے میں بھی زینہ پورہ میں یہ افواہ اُڑائی گئی کہ رشی دلو جموں میں جگموہن سے ملا ہے اور یہ کہ کشمیری پنڈتوں کے کسی فریادی جلوس میں شامل ہوا ہے۔ پہلے تو سچ یہ ہے کہ میں کسی ایسے جلوس میں شامل ہی نہیں ہوا تھا، کیونکہ میرے سارے گھر والے زینہ پورہ میں ہی تھے اور میں جموں عارضی طور کچھ دنوں کیلئے آیا تھا۔ اور اپنے کام میں اس قدر معروف تھا کہ باقی سرگرمیوں کیلئے فرصت ہی نہیں تھی۔ اُن

دِنوں یہاں پر میرے علاقے کے مُسلم بھائی بھی آئے ہوئے تھے اور ہم لگ بھگ روز آپس میں ملتے تھے۔ وہ تو بخوبی میری تمام تر سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھے لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی میرے خلاف افواہ اُڑائی گئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ گورنر سے ملنے کے وقت میرا فوٹو بھی کھچوایا گیا ہے جو سب من گھڑت تھا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر ایسا بھی ہوتا تو کیا۔

شعر

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں رُسوا
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

بہر حال یہ باتیں سُن کر میں نے کشمیر واپس جانے کی جرأت نہیں کی۔ میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ عسکری تنظیموں نے مجھے اپنے ہٹ لسٹ میں سرِ فہرست رکھا تھا۔ لہٰذا اب کشمیر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دیکھتے دیکھتے میں نے ہزاروں کشمیریوں کی طرح اپنے آپ کو بھی بے در و بے گھر پایا۔ اور تب سے جموں میں ہی پریشانیوں کے دن گزارتا آ رہا ہوں۔

اپنی جلاوطنی میں بھی کشمیریوں کو کوئی راحت نہیں ملی۔ یہاں جسطرح مالی امداد لینے والے مائگرنٹ کورپشن کی چکّی میں پس گئے وہ لاقانونیت کی ایک اہم مثال ہے۔ یہ نہیں کہ کورپشن کی اس چکّی میں صرف کشمیری ہندو ہی پسا جا رہا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی منصوبہ بند سازش کے تحت تمام قوم پرست اور حقیقی طور پر سیکولرازم کے حامیوں کو جن

چن کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کشمیری ہندوؤں کی مالی امداد تو ایک انسانیت دوست قدم تھا لیکن کرپٹ آفیسروں، بچولیوں و ایجنٹوں نے اسے اپنے لئے ایک نہایت سود مند دھندے میں بدل ڈالا۔ یہاں بھی وہی پالیسی کارفرما رہی جس کا ذکر بندہ نے وڑداروں اور سود خواروں کے بارے میں کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ریلیف آرگنائزیشن سے وابستہ ملازموں کی اکثریت بھی ہندوؤں کی تھی اور وہ خود بھی اسی طرح اجڑ چکے تھے جس طرح باقی لوگ اجڑ گئے تھے۔ جنھیں مالی امداد دی جاتی ہے۔ لیکن ان ملازموں نے وہ ریکارڈ توڑ رشوت ستانی روا رکھی جسے دیکھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ حکومت نے اپنی روایتی فرقہ پرستی کی پالیسی کے تحت اس بے وطنی کو بھی فرقہ وارانہ ترازو میں تولا۔ جہاں ہندو مہاجرین کو یہ امداد حاصل کرنے میں مختلف قسم کی روکاوٹوں اور مشکل ترین مراحل سے گزر کر مختلف سطح پر مختلف لوگوں کی مٹھی گرم کرنے کیلئے مجبور کیا گیا۔ وہاں مسلم مہاجرین کے نام پر بے حساب رقومات کئی سیاسی لیڈروں اور سیاسی جماعتوں نے حاصل کرنا اپنا پیشہ ہی بنایا۔ دوسرا یہ بھی کہ ہندو مائگرنٹوں کو فوٹو اور بیان حلفیہ دینے کے علاوہ نہایت ہی طویل لال فیتہ شاہی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن مسلمان مائگرنٹوں کے نام پر کچھ سیاسی دلالوں کو اس سب جھنجھٹ کے بغیر جیب داگذار کرنا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے کارندوں اور

موقعہ پرست لیڈروں نے اپنے تمام حواریوں کو بطور مائگرنٹ رجسٹرڈ کروا کے اُن کے نام سرکاری مکانات میں رہائشی آسائش بہم پہنچائی۔ ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں جو سردیوں کے مہینوں میں وادی سے ہر سال دھندے و مزدوری کیلئے یہاں آتے ہیں اور ان میں ایسے بھی لگ بھگ نوے فیصد لوگ ہیں جو کشمیر میں ہی رہائش پذیر ہیں لیکن ریلیف یہاں سے حاصل کرتے ہیں۔

مائگرنٹوں کو مذہب کے نام پر تقسیم کرنے اور انھیں ہندو مائگرنٹ اور مسلم مائگرنٹ کا نام دینے کا سہرا اپنے آپ کو سیکولر کہلانے والی کانگریس پارٹی کے ہی سر ہے۔ اس طرح اس مصیبت زدہ ماحول میں بھی وہ لوگوں میں مذہب کی بنیاد پر امتیاز پیدا کر کے اپنی من مانی تجارت کو چلانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ کانگریس کی جانب سے 1950ء سے کانگریس پارٹی کو ووٹ دینے والے کشمیری ہندوؤں کیلئے ایک اور صلہ تھا۔

1991ء میں مجھے دلی جانا پڑا۔ وہاں میں مارکسی لیڈر ہرکشن سنگھ سرجیت سے ملا۔ میں نے انھیں کشمیر میں واقعہ ہوئے انسانیت سوز اور دلدوز واقعات کی تفصیل بیان کی۔ انھیں میں نے کشمیریوں کے کشمیر سے نکل کر آنے کی وجوہات بھی تفصیل سے بیان کیں۔ رونگٹے کھڑا کرنیوالے قتل و غارت کے کئی واقعات بھی میں نے انکے گوش گزار کیے۔ میں نے انھیں دہشت گردوں و ریاستی حکومت کے ہاتھوں کشمیری مائگرنٹ پنڈتوں کی زیادتیوں کے بارے

میں بھی کہا۔ میری حیرت کی کوئی حد نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ ان پر میری داستان کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اُس نے ایک جملے اس سارے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا — "یہ لوگ (ہندو) بھارتیہ جنتا پارٹی کے حامی ہیں۔" میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے لگا کہ دہشت گردوں اور سُرجیت کی پارٹی کا پروگرام ایک ہی ہے۔ اس پروگرام میں امن پسند شہری کے حقوق کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس جیسی مکھوٹی والی پارٹیوں کی حقیقت تو پہلے ہی میرے سامنے کھلی تھی لیکن اس جواب سے سائنٹیفک سوشلزم کی بات کرنے والی کمیونسٹ پارٹی بھی میرے سامنے بے نقاب ہوئی۔ مجھے لگا کہ یہ لوگ بھی باقی سبھی پارٹی والوں ہی کی طرح کرسی کے پجاری اور ووٹوں کے بکھاری ہیں چنانچہ کشمیری ہندوؤں کی تعداد کم ہے اس لئے اُنکے لئے کشمیری ہندوؤں کی اہمیت ہی نہیں۔ اہمیت ہی کیا، اُسکو جینے کا حق ہی نہیں ہے سُرجیت کے دوٹوک جواب سے صاف ظاہر ہوا کہ ہمارے دیش کے بڑے بڑے نیتا ہی بغل میں چھری اور منہ میں رام رام والے ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر، رہنما نہیں بلکہ رہزن ہیں۔ اور یہی لوگ عوام اور سماج کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک پر بارِ گراں ہیں۔ چنانچہ اپنے آپکو مساوات کا علمبردار کہنے والا شیخ عبداللہ بھی کشمیری ہندوؤں کو بخش نہ پایا۔ اُس نے "آتشِ چنار" میں انھیں ہندوستانی ایجنٹ اور فتنہ کا لمیٹ کا خطاب دیکر ایک طرح سے انھیں قوم پرست

ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ کیونکہ ہمارے دیش میں جو قوم پرست ہے اسکی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں اہمیت اگر ہے صرف دیش دروہیوں، سمگلروں، چوروں اور قاتلوں کی ہے جو کہ ہماری کشمیری کمیونٹی میں ندارد ہیں۔

دراصل یہ بات بدقسمتی کی ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور ہی ایسے سیاسی مسخروں کے ہاتھ میں ہے جو نیتا نہیں بلکہ سیاسی شطرنج کے کھلاڑی ہیں اور اپنے ملک اور اسکی عظیم روایات سے انھیں کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی کسی آقا کے غلام ہیں اس لیے اپنے ضمیر کی آواز سن کر بھی ان سنی کر دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ذہن اپنے آقا کے پاس گروی رکھا ہے۔

یہی حال ہمارے عالمی شہرت یافتہ صحافیوں کے ایک طبقہ کا بھی ہے جو حقیقی واقعات کے برعکس کشمیر کی تصویر کا دوسرا رخ اپنے مضحکہ خیز انداز میں دکھاتے ہیں۔ مجھے اس ضمن میں جسونت سنگھ، تارکنڈے، پی۔ ایس۔ جھا اور کوئی بوس صاحب جیسے ادیب یاد آتے ہیں۔ جنھوں نے کشمیری پنڈتوں اور باقی قوم پرست مسلموں کے حالات زار کی چشم پوشی کی اور کبھی یہ جرأت نہ کی کہ وہ بے باکانہ انداز میں انکے مسائل کو سامنے لائیں۔ ایسے صحافیوں نے کشمیر کی وہ تصویر پیش کی جس سے حقائق پر پردہ پڑ گیا۔ دہشت گردوں نے لاکھوں کی تعداد میں کشمیری ہندوؤں اور سیکولر نظریہ کے حامی کشمیری مسلموں کے باغات، مکانات، زمین و تجارت وغیرہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ کشمیر میں ان کا صفایا کرنے

کے بعد اب اِن دہشت گردوں نے اپنی توجہ، ڈوڈہ، پونچھ اور راجوری کی طرف مبذول کی ہے۔ لیکن ہمارے صفِ اوّل کے یہ ادبا اپنی آنکھیں موندے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ بھی کچھ نام نہاد سیاسی نیتاؤں کی طرح پسِ پردہ کسی بین الاقوامی سازش میں ملوث ہیں۔ اِس سازش کا پردہ چاک کرنا ہی ہر محبِ وطن کا فرض ہے۔ نہیں تو ہندوستانی عوام مذہبی منافرت، ذات پات اور علاقوں کی تقسیم کے بعد ہر سطح پر کمزور ہو کر جنگ باز اور لٹیرے عناصر کا نشانہ بن سکتا ہے۔

موجودہ حالات سے ہمارا طالب علم طبقہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ وادی سے نکالے جانے کے بعد جب کشمیر کی آبادی کا بڑا حصہ جموں میں سکونت پذیر ہوا تو بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ گورنمنٹ نے کشمیری بچوں کو جموں کے گورنمنٹ سکولوں میں و کالجوں میں داخلہ دینے سے انکار کیا۔ الگ سے کیمپ کالج و سکول قائم کیے گئے لیکن اِن میں بنیادی سہولیات کا فقدان تھا۔ اُن میں لائبریری اور لیبارٹری کی سہولیتیں فراہم نہیں تھیں۔ کہیں کہیں چلچلاتی دھوپ میں یا جاڑے اور سرما کی ٹھٹھکتی ٹھنڈ میں ہمارے بچوں کو کھلے آسمان کے نیچے اپنی پڑھائی کو جاری رکھنا پڑا۔

کلاسوں میں بنیادی سہولیات کی عدم دستیابی کے علاوہ امتحانوں کا بھی ایک مسئلہ پیدا ہوا۔ محکمہ تعلیم نے اُن کے ساتھ جو امتیازی سلوک روا رکھا۔ اُس کی مثال کسی بھی جمہوری نظام میں پانا مشکل ہے۔

ہمارے بچوں کو تین سالہ ڈگری کورس کیلئے اپنی زندگی کے چھ سال اور کبھی چھ سال سے زائد بھی ضائع کرنے پڑے۔ اسی طرح ایسا بھی کہا گیا کہ کشمیر یونیورسٹی مائگرنٹ بچوں کیلئے الگ پرچہ اور کشمیر میں رہنے والے بچوں کیلئے الگ سیٹ کرتی ہے۔ ایسا صرف اس لئے کیا جاتا تاکہ جموں میں رہ رہے طلباء و طالبات کیلئے مشکل سے مشکل پرچہ جات سیٹ کرکے اُن کے میرٹ اور قابلیت کو بھی نشانہ بنایا جاسکے۔ اسطرح ہمارے بچوں کے کیریئر کو بگاڑنے کے لئے حکومتی سطح پر طرح طرح کے حربے اپنائے گئے۔ ہمارے بچوں کیلئے روزگار کے ذرائع و وسائل بہت ہی محدود تھے۔ لیکن ۱۹۹۰ء کے حالات کے بعد یہ مواقع اور بھی محدود ہو گئے۔

روزگار کے مواقع محدود ہونیکی وجہ سے ہمارے بچوں کو ملک کی دوسری ریاستوں کا رُخ کرنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ اپنی ریاست کے انتظامیہ کیلئے مائگرنٹ کے نام سے ہی اتنی نفرت ہے کہ وہ اُسے جموں میں بھی سُکھ چین سے رہنے دینے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ اسی میں خوش ہے کہ یہ لوگ اس طرح بکھر جائیں کہ ریاست میں دُبارہ اِن کا نام و نشان نہ رہے۔

کشمیر سے نکل کر بہت سارے بے گھر لوگوں کو خیموں میں کئی سال گزارنے پڑے۔ جہاں کہ تیز ہوا، آندھی اور برسات کے دِنوں میں ہاہا کار مچ جاتا تھا۔ آجکل اب اِن کیمپوں اور خیموں میں رہ رہے مصیبت زدگاں کو کبوتر خانہ نما کمرے (Pigeon Holes) فراہم کئے گئے ہیں لیکن یہ مائگرنٹ بستیاں صحت و صفائی کے لحاظ سے

ابھی بھی پسماندہ ہیں۔ ناموزوں آب وہوا اور نامعقول و نامناسب سہولیات کی وجہ سے بہت سے کشمیری مختلف قسم کی جسمانی و ذہنی امراض کے شکار ہوئے ہیں۔ ایسی مشکل کا شکار صرف کشمیری ہندو ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ وہ قوم پرست مسلم مائگرنٹ بھی جس کو اپنی مذہبی رواداری کی بنا پر کشمیر سے بھاگنا پڑا۔ جو لوگ گورنمنٹ کی طرف سے فراہم کردہ رہائش سے محروم ہیں اور جموں و دیگر شہروں میں اپنی بنیادی ضرورتوں اور بچوں کے اخراجات کا گلا گھونٹ کر بھاری کرایہ ادا کرتے ہوئے پرائیویٹ کمروں میں رہتے ہیں۔ انکی تکلیف کی داستان اور بھی دردناک ہے۔ مکان مالکوں کے رحم و کرم پر در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ان لوگ کرایہ کے مکانوں میں رہنے والے صرف اپنے جی اور جان کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

کشمیر سے نکل کر کشمیری مہاجرین کو جن نامناسب حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر کئی تصانیف شائع ہو کر ہمارے سامنے آئی ہیں بہت سے لوگ جو کشمیر سے دہشت گردوں سے مارے جانے کے ڈر سے بھاگ کر آئے تھے۔ انھیں یہاں قدرت کی طرف سے پیش کردہ نامناسب حالات کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کچھ لوگ لو سے کچھ سانپ کے ڈسنے سے اور کچھ ان بیماریوں سے لقمۂ اجل

ہو گئے، جن بیماریوں سے 1990ء سے پہلے کشمیری لوگ ناواقف تھے لیکن حکومت کی طرف سے ہر وقت ان مصائب کو نظر انداز کیا گیا۔

اپنے مصائب کا ازالہ کرانے کیلئے اگر کبھی کوئی مائیگرنٹ وفد کسی بھی افسر سے ملنے بھی گیا۔ لیکن اسکی بات کو جان بوجھ کر ان سنی کر دیا گیا۔ گریش چندر سکسینہ کے گورنر بن جانے کے بعد آل انڈیا کشمیری سماج نے اُن کے پاس ایک وفد بھیج کر اپنے مسائل کے بارے انھیں واقف کرانے کا فیصلہ کیا۔ بڑی جدوجہد کے بعد ملنے کا وقت مقرر کیا گیا۔ اس طرح سے 16 جون 1993ء کو ایک وفد گورنر سے اپنے مسائل لیکر ملنے گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ وفد اُن کے سامنے اپنے مسائل رکھے۔ اُس نے وہاں موجود سامعین کو ایک لمبی چوڑی تقریر سے نوازا۔ اُس نے جان بوجھ کر وفد کو سُنانے کیلئے کچھ ناخوشگوار باتیں کہیں۔ جن میں یہ باتیں بھی شامل تھیں:۔

1۔ وہ مسلمانوں کو ناراض نہیں کر سکتا۔

2۔ اُن کو ہندوؤں کو ملاقات دینے کیلئے وقت نہیں تھا۔

3۔ اگر ہمیں کوئی شکایت یا مسئلہ ہے تو ہمیں اسے تحریری صورت میں پیش کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے حاکم ہی فرقہ وارانہ لائینز پر لوگوں کو بانٹتے رہے۔ اور ان حکمرانوں میں ریاستی حکمران ہی نہیں بلکہ دہلی کی طرف سے

بھیجے گئے گورنر حضرات بھی جو اپنے آپ کو وادی میں وارد ہونیکے ساتھ ہی جنتا کا راجہ سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنے لئے ایک کمرہ حاصل کرنے کیلئے مختلف افسروں اور سیاسی لوگوں کے دروازوں پر دستک دی لیکن یہ سب کچھ دشت نوردی کی طرح ثابت ہوا۔ یعنی مجھے اس طرح بھلایا گیا جیسے میرا وجود ہی کبھی تھا نہیں۔ مجھے فریڈم فائیٹرز پنشن جو تب ساڑھے سات سو روپے ماہانہ تھی۔ اس بڑھاپے میں اپنے آپ اور اپنی شریک حیات کے کھانے پینے اور صحت وغیرہ کیلئے ناکافی تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے ایک کمرہ کہیں ملے، کم سے کم کرایہ کی رقم بچ جائے گی لیکن حکومت کی طرف سے مجھے اتنی چھوٹی آسائش یا مدد نہیں ملی کیونکہ حکومت کے پاس میرے لئے کمرہ نہیں تھا، جبکہ ان دنوں پورا ایم۔ ایل۔ اے ہوسٹل دہشت گردوں کے ہمدردوں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ میں نے اس کمرے کیلئے جنتا دل کے پریذیڈنٹ اور گورنر کو بھی درخواست دی۔ پھر کانگریس پریذیڈنٹ غلام رسول کار کے ذریعے بھی گورنر کے پاس اپنی گزارش بھیجی۔ ادھر زینہ پورہ میں میری مائگریشن کے بعد ہی میرے مکان کو دہشت گردوں نے بم سے اڑایا تھا۔ اور گھر کے سارے سامان کے سمیت پورا مکان خاکستر ہوا تھا۔ اس وجہ سے بھی میں گورنمنٹ رہائش کیلئے اپنے آپ کو زیادہ حقدار سمجھنے لگا تھا۔ دوسرا مجھ سے بہت کم اہمیت کے سیاسی کارکنوں کو یہ سہولت پہلے ہی فراہم کی گئی تھی۔ ان میں ایسے بھی لوگ شامل تھے جو ابھی بھی کشمیر میں ہی رہتے تھے لیکن یہاں جموں میں اس

سرکار کی طرف سے فراہم کردہ رہائش میں عارضی طور سکونت کرتے تھے۔ میں اپنی عرضی کا منتظر رہا۔ لیکن وہ جواب مجھے اب تک بھی نصیب نہ ہوا ایک بار میں ایڈوائزر گورنر حمید اللہ بانہالی سے بھی اس سلسلے ملا۔ اس نے جھوٹی موٹی ہمدردی جتلا کر ایڈوائزر ذکی کو میری درخواست بھیج دی۔ مگر بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ وہ یہ سب مجھے ٹالنے کی غرض سے کر رہا تھا اور وہ ہمدردی قطعاً جھوٹی تھی۔

اس طرح سے میں ساڑھے سات سو روپے میں اپنی بیمار بیوی اور اپنے بڑھاپے کی لاچاریوں اور مجبوریوں سے جھوجھتے ہوئے گزارہ کر رہا ہوں اور وہ لوگ جن کی سیاسی زندگی کو میں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا سنوارا۔ انھیں نہ صرف سرکاری رہائش ہی حاصل ہے بلکہ وہ دو دو ہاتھوں سے حکومت کو لوٹ بھی رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاست کی کمیونسٹ پارٹی کے کچھ رہنما۔ یہ میری ہی بدقسمتی ہے کہ مجھے ایک کمرے کیلئے ان کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں سے بھی عرضداشت کرنی پڑی لیکن وہ کہاں ٹس سے مس ہوتے۔ مائگریشن نے انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر براجمان کیا تھا۔ وہ میری بدحالی کو اور کیا دیکھتے کیونکہ میری بدحالی سے ہی وہ لوگ خوش حال ہوئے تھے۔

اسی بیچ جموں میں مالکانِ باغات کی ایک تنظیم وجود میں آئی تھی۔ جس کا نام "فروٹ گروورس ایسوسی ایشن" تھا۔ اس کے صدر جیالال گیرو تھے۔ انھوں نے ایک بار سارے مائگرنٹ مالکانِ باغات

سے درخواستیں طلب کی تھیں جسمیں اراضی و فصل وغیرہ کی تفصیل ہو۔ میں بھی فارم بھرنے گیا۔ یہ فارم گیتا بھون جموں میں بھرنے تھے۔ وہاں جیسا لال گیرو اور دیگر لوگ اس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالنے پر مجھے اصرار کرنے لگے۔ کیونکہ ان کی نظر میں، میں مختلف سیاسی لیڈروں کیساتھ پرانی واقفیت رکھتا تھا۔ اور یہ تمام مالکانِ باغات کے مطالبات منوانے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ بہرحال مجھے اس تنظیم کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس تنظیم کے ذریعے ہم نے حکومتِ وقت سے باغوں کی حفاظت اور فصلوں کو لوٹ کر لینے کے معاوضے کا دعوے کیا۔ ہم نے پورے ملک کی سیاسی تنظیموں سے اپنے نقصان کی بھرپائی کرنے کی درخواست کی۔ ان تنظیموں میں کانگریس، جنتا دل، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے شری کیدار ناتھ ساہنی کے بغیر کسی جماعت یا کسی پارلیمنٹ ممبر نے ہمیں جواب تک نہیں دیا۔ مجھے اس بات کا ازحد دکھ ہے کہ مفتی محمد سعید جو کہ ان دنوں ہندیونین کا ہوم منسٹر تھا اور میرا ساتھی رہ چکا تھا۔ اس نے بھی اس رجسٹرڈ میمورنڈم کا اکنالیج منٹ تک بھیجنا ناگوار اور نامناسب سمجھا۔ ہم لوگوں نے کئی بار پریس کانفرنس بھی منعقد کیں لیکن اس سب کے باوجود بھی ہمارے جائز مطالبات کو ہر سطح پر نظرانداز کیا گیا۔ جبکہ وادیٔ کشمیر میں رہ رہے ہوٹل مالکوں اور ہاؤس بوٹوں کے مالکوں کی امداد میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کا اور ہمارا معاملہ یکساں ہی

تھا بلکہ دہشت گردی کی وجہ سے اُن سے زیادہ نقصان جانی و مالی ہمکو ہی اُٹھانا پڑا تھا۔ کیونکہ ہمارے باغات میں صرف سالانہ فصل کا نقصان ہی نہیں بلکہ پیڑوں کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہوٹل والوں اور ہاؤس بوٹ والوں کو کیوں امداد دی گئی لیکن ہمارا یہی مطالبہ ہے کہ اگر وہ امداد کے حقدار ہیں۔ کیا ہم نہیں ہیں۔؟

کچھ مدت کے بعد ہم میں سے کچھ لوگوں نے ایم۔ ایل۔ کول صاحب کے سامنے اپنے مطالبات رکھنے کی ضد کی۔ کیونکہ کول صاحب کو حکومت کی طرف سے مائگرنٹوں کی باز آبادکاری کے امکانات کا جائزہ لینے کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ جب ہم گاندھی نگر میں واقع اُسکی رہائش گاہ پر پہنچے تو وہاں ہم سے کہا گیا کہ تین گھنٹے کے بعد آنا۔ کیونکہ صاحب آرام فرما رہے ہیں۔ اُس کے کچھ مہینے بعد سرکٹ ہاؤس میں اسی ایم۔ ایل۔ کول نے اننت ناگ و پلوامہ کے مائگرنٹ لیڈروں کی ایک میٹنگ منعقد کی تھی۔ اس میٹنگ میں میرا بھی جانا ہوا۔ اس میٹنگ میں مائگرنٹوں کی واپسی پر گفت و شنید ہوتی تھی۔ لیکن جب میرے بولنے کی باری آئی تو میں نے کول صاحب کو دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ اُس دن گاندھی نگر میں اپنے مطالبات پیش کرنے کیلئے تین گھنٹے انتظار کروایا لیکن اگر کشمیر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تو کیا ہم آپ کو اپنی گہری نیند سے آسانی اُٹھا سکتے ہیں اور جو شخص صرف ملاقات کیلئے تین تین گھنٹے منتظر رکھتا ہے کیا وہی شخص کشمیری مائگرنٹوں کا تارن ہار بن سکتا ہے۔ کول صاحب کے پاس اس کے لئے کوئی

جواب ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا سا منہ لیکر دیکھتے ہی رہ گئے۔

ایک اور تنظیم ۔ "فورم فار ڈائلاگ اینڈ ایمٹی" ہے۔ اس تنظیم کا مقصد عوامی سطح پر لوگوں کے درمیان وہ رشتے پھر سے قائم کرنے ہیں، جو کشمیریت کا خاصہ ہیں۔ میں اس تنظیم کا کنوینر مقرر ہوا۔ ایک دن اسی تنظیم کی کسی سرگرمی کے سلسلے میں مفتی سعید سے ملاقاتی ہوا۔ ان دنوں وہ منسٹری میں نہیں تھے۔ میں نے انھیں شکوہ کیا کہ آزادی کے مجاہدوں کو مذہب کے نام پر لوگوں کو بانٹنا اور ان کے ساتھ امتیاز برتنا، اپنے آپ کو سیکولر بتانے والے دعویداروں کو زیب نہیں دیتا۔ کشمیری اقلیتی فرقہ ووٹ بنک نہیں ہے اگرچہ اس پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے پھر بھی ہمارے سیاسی لیڈر اس کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کا اس بات کیلئے بھی طنزاً شکریہ ادا کیا کہ کانگریس صدر ہوتے ہوئے جو نفرت کا بیڑا اس نے 1986ء میں لگایا تھا۔ وہ بیڑا اب تناور درخت بن گیا ہے۔ اور صرف اسی کی مہربانی سے آج ہم لوگ اپنی پیاری جنم بھومی سے نکال دئے گئے ہیں۔ اور سارے زمین و جائداد سے محروم ہو کر مصیبت کے دن گزار رہے ہیں۔

کچھ سال پہلے نیشنل کانفرنس کی قیادت میں عوامی حکومت قائم ہوئی۔ ہم نے دوبارہ اپنے مطالبات کو منوانے کیلئے کوششیں شروع کیں۔ ہم متعلقہ منسٹروں یعنی صفدر بیگ صاحب، پیارے لال ہنڈو اور عبدالاحد وکیل وغیرہ کے پاس وفود لیکر گئے۔ ان سے ملے۔ اور ہمارے مطالبات پر غور فرمانے اور توجہ دینے کی مودبانہ گزارش کی چیف

منسٹر فاروق عبداللہ کے نام رجسٹرڈ میمورنڈم روانہ کیئے مگر آج تک کوئی بھی کاروائی نہیں ہوئی۔ البتہ ایک بات ضرور سنتے ہیں کہ حالات نارمل ہو رہے ہیں اور اب باغات کے درخت ہی کاٹے جاتے ہیں تاکہ نہ رہے گی بھینس نہ بجے گی بانسری۔

یہ حکومت بارہا ملیٹینسی کے ختم ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور حالات کے نارمل ہونے کا پروپیگنڈا کر رہی ہے۔ اپنے دعوے کو اس دلیل سے بھی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں کہ الیکشن صاف ستھرے طریقے سے ہوئے۔ میں ان پروپیگنڈا کرنے والوں سے یہ ایک بات پوچھنا چاہوں گا کہ میرا اور میرے بال کا ووٹ کس نے کس کو ڈالا؟

حالات کی بحالی کی باتیں ہم کئی سالوں سے سن رہے ہیں لیکن اس کے برعکس دہشت گردی کی آگ وادی سے نکل کر ڈوڈہ، کشتواڑ، پونچھ اور راجوری میں پھیل گئی ہے آخر یہ آگ پھیلے گی نہیں تو اور کیا ہوگا! کیونکہ سیاسی چالبازوں نے اپنے طور طریقے ابھی بھی نہیں بدلے ہیں۔ بلکہ وہ تنگ نظر سوچ سے پہلے ہی آلودہ ماحول کو اور آلودہ کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی حیرانی ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی دیش ہے جس دیش میں چندر شیکھر آزاد، بھگت سنگھ اور سبھاش چندر بوس جیسے سرفروش، محب وطن لیڈر ہوئے ہیں۔ آج ہر طرف سیاسی شاطروں کا بازار گرم ہے۔ سیاست لوگوں کی خدمت کے برعکس، خالص کنبہ پروری اور کمائی کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے اس میں صرف شخص پرستی، فریب، دغا بازی اور جوڑ توڑ ہی اب

باقی رہ گیا ہے۔ مجھے کئی لوگوں نے بارہا اپنی سیاسی جماعتوں میں آنے دعوت دی لیکن آج کی سیاست دیکھکر میرا دل اُچاٹ ہوتا ہے۔ شیخ نظیر نے ایک بار مجھے نیشنل کانفرنس میں آنے کی دعوت دی لیکن میں نے اُسے کہا کہ اگر یہ 1953ء سے پہلے کا نیشنل کانفرنس ہوتا تو میں ہنسی خوشی اس میں شامل ہوتا۔ لیکن اس نیشنل کانفرنس اور تب کے نیشنل کانفرنس میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ہم زمین کے لوگ آسمان پر بسر نہیں کر سکتے۔ اس طرح سے میں نے اُسکی یہ دعوت ٹھکرائی۔

آج کی سیاست نے دیانتدار اور محبِ وطن لوگوں کو حاشیے پر لا دیا ہے اور باگ ڈور اُن سیاسی مسخروں کے ہاتھ میں ہے جو کشمیری عوام کو ذہنی طور پر دو صدیاں پیچھے لیجانے میں کوشاں ہیں۔ یہ لوگ خالی سڑکیں اور مدارس بننے کو ترقی کہتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ مادی ترقی تب تک ادھوری ہے جب تک اسکے ساتھ ساتھ اخلاقی، ذہنی اور سماجی قدروں کی ترقی نہ ہو۔ اُس ترقی کو ہمہ گیر ترقی نہیں کہہ سکتے جسمیں عوامی شعور بالغ نہ ہو اور سیاسی طور بیدار نہ ہو جائیں اور صحیح سوچ اور احساسِ ذمہ داری نہ آجائے۔

لہذا جب تک نہ سیاسی مسخروں کی جگہ نوجوانوں کا وہ طبقہ سامنے آئے جو پڑھا لکھا بھی ہو اور سائنسی ترقی سے بخوبی روشناس بھی ہو۔ تب تک حالات کا پارہ ایسا

ہی رہے گا۔

ایک بار سہروردی نے اسمبلی میں کہا تھا کہ "میں پہلے مسلمان ہوں اور اسکے بعد ہندوستانی یا کشمیری"۔ ہمیں ایسے سوچ کو تبدیل کرنا ہوگا۔ مذہبی جنونوں کے کالے بادلوں کو اپنے ذہنی آسمانوں سے دور کرنا ہوگا۔ بھوک، غریبی اور مذاہب کے مابین منافرت کیساتھ جنگ لڑکے مساوات اور انصاف پر مبنی سماج کو نئی تشکیل دینی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ عالمی رائے عامہ پاکستان کو اپنی ہٹ دھرمی ترک کرنے پر مجبور کرے تاکہ وہ کشمیر میں اپنی مداخلت چھوڑ دے۔ زبانی زبانی سیکولرازم کی رٹ لگانے والے جب تک عملی طور کچھ کرنے کے اہل نہ ہوں، تب تک ہماری ریاست میں سچے سیکولر لوگ دبے ہی رہیں گے۔ تب تک عبدالستار رنجور اور غلام نبی گلکر جیسے لوگ تشدد کا شکار ہوتے رہیں گے۔

جموں کشمیر کی سیاسی تحریک انقلابی ڈھنگ سے شروع ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس میں انقلاب دشمن نظریات سے عوام کے ذہن کو آلودہ کیا گیا۔ نتیجہ کے طور پر عام آدمی گوناگوں مسائل سے دوچار ہو گیا۔ دورِ حاضر میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ سیر دنی خطرات کا مقابلہ کرنے والوں کی صف میں گرم جوشی سے تو حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف کے اقدار کو عملی صورت دینے کیلئے ہمارے لیڈروں کو نظریاتی طور باشعور، دیانت دار اور عوام دوستی و بھائی چارے کے جذبات کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ تبھی عوام کو سازشی عناصر کے چنگل سے نکال کر امن، جمہوریت، رواداری اور آپسی برادری و بھائی چارہ کے نظام کو قائم رکھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ تحریک کی سنہری روایات کو زندہ و قائم اور یاد کر کے لوٹ کھسوٹ کو قائم رکھنے والے مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے والے سازشی اور چاپلوس عناصر کی چالبازیوں کو ناکام بنا کر ہی فاروق عبداللہ باہر کی سازش کو ناکام بنانے کا موجب بن سکتا ہے۔ ساتھ ہی ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ کسی فرقہ، کسی علاقہ یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس مہم میں شامل ہو کر لوگوں کو توڑنے کے بجائے جوڑنے کیلئے کام کریں۔

آخر میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ کھوکھلے اور جذباتی نعروں کا دور اب چلتا ہو گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلاب نے زندگی کے ہر شعبہ اور انسان کے وجود کو اثر انداز کیا ہے۔

پیداواری قوتوں کے فروغ نے سماجی زندگی میں اس متضاد، پیچیدہ اور متحرک دنیا نے سماجی نابرابری کے نظام میں ایسے قوائد پیدا کئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کو ہی زندگی کا آخری مقصد سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ فسادات، فرقہ وارانہ منافرت اور ذات پات کی امتیازی آگ کو پھیلا کر لوگوں کو توہمات، تعصبات اور نا امیدی کے عالم میں رکھتے ہوئے اپنے لوٹ کھسوٹ کے تمام طور طریقوں کو استحکام بخشنے کے درپے ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں تھوڑا سا مقابلہ کرنے کیلئے فرد نے کسی طرح منظم ہونا شروع کیا۔ یہ طاقتیں تبھی جابرانہ طریقہ اختیار کر کے لوگوں کو دباتی ہیں۔

دورِ جدید میں بھی ایسے ہی استحصالی عنصروں نے قاتلوں، غنڈوں و چاپلوسوں سے بھری تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ ان کو ہر کسی وقت اور حالات میں کام میں لا کر اقتدار پر قبضہ کر کے یہ لوگ اپنی لوٹ کے مفاد کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

انسانیت کے سامنے آج اس منافرت کی فضا میں ایٹمی قوت کا خطرہ بھی انسانی وجود کی بقا پر منڈرا رہا ہے۔ آج کا مسئلہ ماحول کی آلودگی کا مسئلہ ہے۔ آبادی بے انتہا بڑھ رہی ہے۔ لیکن ہمارے تنگ نظر اور موقعہ پرست سیاستدان عام آدمی کو ان تمام باتوں پر سوچنے سے دور رکھنے کیلئے دوسرے غیر ضروری مسائل کھڑا کرنے کے لئے نئے نئے ہتھکنڈے اپنا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تقریروں، تحریروں اور ایسی کتابوں کی تخلیق ہو جس سے نوجوان طبقہ مستقبل میں انسان کی بقا پر غور

کرے اور ان سب اہم مسائل اور بے کاری، بے روزگاری، بھوک اور بیماری کے ازالہ کے لئے منظم ہو کر جد و جہد کرے۔ کسی ایک فرد کو اس صورتِ حال کا تماشہ گیر بننے کے بجائے چاہیئے کہ وہ عوام کو ان خطرات سے بیدار کرے۔ اُنکے ذہن میں یہ بات بٹھائے کہ یہ سب بُری باتیں ہی ہماری ترقی میں سدِ راہ ثابت ہونگی۔ لوگوں کی جاگرتی کے بعد ہی اُن کی طاقت کے بل بوتے پر ایسی ساری بُرائیاں انسانی سماج سے اُکھاڑ پھینکنا ممکن ہو سکتا ہے۔
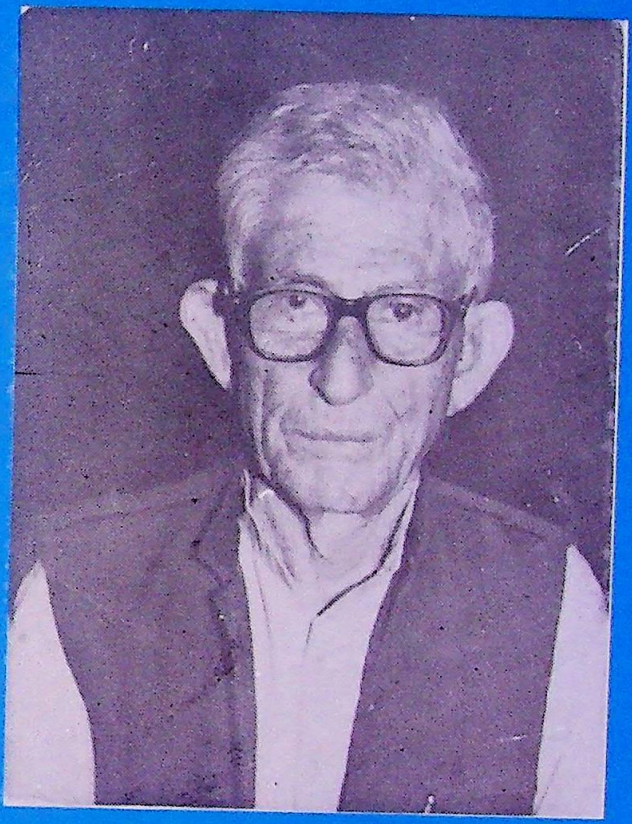
(اب کی بار اتنا ہی)